DAMAGE BOOK

UNIVERSAL
LIBRARY
OU_222550
UNIVERSAL
LIBRARY

URDU LITERATURE READER.

کمک اردو

KUMUK-I-URDU

SELECTED AND ANNOTATED
BY

MOULVI MUHAMMAD ISMAIL, K. S.,
AUTHOR OF
KULLIAT-I-ISMAIL, ETC.,
Retired Persian Teacher, Central Normal School, Agra.

—— :o: ——

PRESCRIBED AS TEXT-BOOK
FOR
CLASSES V & VI OF THE ANGLO-VERNACULAR SCHOOLS
BY ORDER OF
The Director of Public Instruction, United Provinces.

—— :o: ——

The NEWUL KISHORE PRESS,
HAZRATGANJ, LUCKNOW.

First Edition 1909.
Enlarged Edition 1912.
Third Edition 1913, 1,500 copies.
Fourth Edition 1914, 15,000 copies.
Fifth Edition 1917, 5,000 copies.
Sixth ,, 1918, 7,500 ,,
Seventh Edition 1919, 5,000 copies.

Copyright Reserved.] [Price As 6 per copy.

فہرست مضامین نشر "کمک اُردو"

نمبر مضمون	نام مضمون	نام مصنف	صفحہ
۱	نیک صحبت کا اثر	از شمس العلما ڈاکٹر مولوی نذیر احمد مرحوم	۱
۲	سچ کی تاثیر	از مؤلف	۹
۳	ایک ویران شہر پر بندروں کا قبضہ	از منشی عنایت اللہ بی۔ اے	۱۳
۴	معاش	از مؤلف	۲۱
۵	دلیری	〃	۲۵
۶	باتیں گھڑنی	از شمس العلما خان بہادر مولوی ذکاء اللہ مرحوم	۲۸
۷	پھر کوشش کرو	از مؤلف	۳۱
۸	سوامی جی کا پہلا سفر	از سدرشن کا میلہ	۳۷
۹	مُعافی اور انتقام	از مؤلف	۴۵
۱۰	سفر نامہ	از شمس العلما مولانا شبلی نعمانی	۴۹
۱۱	ہمدردی	از شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالی	۵۸
۱۲	زراعت و حرفت	از شمس العلما ڈاکٹر مولوی نذیر احمد مرحوم	۷۱
۱۳	شہنشاہی دربار	〃	۷۷
۱۴	شرافت پر مُکالمہ	〃	۸۲

نمبر مضمون	نام مضمون	نام مصنف	صفحہ
۱۵	اطاعت	از مولوی سجاد مرزا بیگ دہلوی	۹۱
۱۶	قرض	از مولانا وحید الدین سلیم	۹۵
۱۷	اہلِ فرنگ عہد اکبر میں	از شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد	۹۹
۱۸	خوشامد	از ڈاکٹر سر سید احمد خاں مرحوم	۱۰۴
۱۹	خط	از مولوی کریم بخش مرحوم	۱۰۹
۲۰	〃	〃	۱۱۳
۲۱	خطوط	از مؤلف	۱۱۷

حصّہ نظم

نمبر مضمون	نام مضمون	نام مصنف	صفحہ
	مثنویات ۶		۰
۱	آب زلال	از مؤلف	۱۲۳
۲	ایک مسافر اور وطن کی یاد	از حالی	۱۲۷
۳	مناقشہ ہوا و آفتاب	از مؤلف	۱۲۹
۴	مثنوی	از نذیر احمد	۱۳۱

نمبر مضمون	نام مضمون	نام مصنف	صفحہ
۵	حیا	از مؤلف	۱۳۳
۶	مثنوی بادِ مراد	〃	۱۳۴
	غزلیات ۴۸	حالی، اکبر، ظفر، نظیر، ذوق،	۱۳۸
		میر، آتش، سودا، انشا،	تا
		غالب، رند، ناسخ،	۱۶۴
	قصائد ۳		
۱	تہنیت جشن جوبلی کوئین وکٹوریا	از اکبر	۱۶۵
۲	بیٹے کی خوشی	〃	۱۶۹
۳	انتخاب از قصیدہ	از نذیر احمد	۱۷۱
	قطعات ۱۳		
۱	تجارت	از اکبر	۱۷۳
۲	سرسید کی وفات	〃	〃
۳	آموں کی فرمائش	〃	۱۷۴
۴	شرم	〃	〃
۵	غفلت	〃	۱۷۵

نمبر مضمون	نام مضمون	نام مصنف		صفحہ
۶	وفاداری	از اکبر		۱۷۵
۷	نوکری اور جاہ طلبی	〃		۱۷۶
۸	قرض	از مؤلف		〃
۹	شب تنہائی	از ذوق		۱۷۸
۱۰	نیک و بد کی شناخت	〃		۱۷۹
۱۱	دوست کو ٹھہرانے کے حیلے	〃		۱۸۰
۱۲	تغیر حالات	از ظفر		۱۸۱
۱۳	احوالِ دل	از نظیر		〃
	مُسدّس ۱			
	تعلیم	از حالی		۱۸۲
	ترکیب بند ۱			
	مرثیۂ رحلت کوئن وکٹوریا	از حالی		۱۸۷
	رباعیاں ۹			۱۹۴
		حالی، مولف، جرأت	تا	۱۹۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(از شمس العلما ڈاکٹر مولوی نذیر احمد ایل ایل ڈی)

نیک صحبت کا اثر

سلیم ابھی سو کر بھی نہیں اُٹھا تھا کہ بیدار انے آجگایا کہ "صاحبزادے اُٹھیے بالا خانے پر میاں بُلاتے ہیں"۔ سلیم کی عُمر اِس وقت کچھ کم دس برس کی تھی۔ سلیم نے جو طلب کی خبر سُنی، گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا، اور جلدی سے ہاتھ مُنھ دھو۔ ماں سے آکر پوچھنے لگا۔

"اماں جان! تم کو معلوم ہے۔ ابّا جان نے کیوں بُلایا ہے؟"

ماں۔ بھائی مجکو تو کچھ خبر نہیں۔

بیٹا۔ کچھ خفا تو نہیں ہیں ؟
ماں۔ ابھی تو کوٹھے پر سے بھی نہیں اُترے۔
سلیم۔ بیدارا تجھ کو کچھ معلوم ہے ؟
بیدارا۔ میاں! میں اوپر لوٹا لینے گئی تھی۔ میاں اکیلے بیٹھے ہوئے کتاب پڑھ رہے تھے میں آنے لگی تو میاں نے آپکا نام لیا۔ اور کہا کہ اُن کو بھیجدو۔
سلیم۔ صورت سے کچھ غصّہ تو نہیں معلوم ہوتا تھا ؟
بیدارا۔ نہیں تو۔
سلیم۔ تو اماں جان ذرا تم بھی میرے ساتھ چلو۔
ماں۔ میری گود میں لڑکی سوتی ہے۔ تم اتنا ڈرتے کیوں ہو جاتے کیوں نہیں۔
سلیم۔ کچھ پوچھیں گے ؟
ماں۔ جو کچھ پوچھیں گے۔ تم اُسکا معقول طور پر جواب دینا۔
غرض سلیم ڈرتا ڈرتا اوپر گیا اور سلام کرکے الگ جا کھڑا ہوا۔ باپ نے پیار سے بُلا کر پاس بٹھایا اور پوچھا

"کیوں صاحب! ابھی مدرسے نہیں گئے؟"

بیٹا۔ جی بس جاتا ہوں۔ ابھی کوئی گھنٹے بھر کی دیر اَور ہے۔

باپ۔ تم اپنے بھائی کے ساتھ مدرسے جاتے ہو یا الگ؟

بیٹا۔ کبھی کبھار بھائی جان کے ساتھ چلا جاتا ہوں ورنہ اکثر اکیلا جاتا ہوں۔

باپ۔ کیوں؟

بیٹا۔ اگلے مہینے اِمتحان ہونے والا ہے۔ چھوٹے بھائی جان اُسی کے واسطے تیّاری کر رہے ہیں۔ صُبح سویرے اُٹھکر کسی ہم جماعت کے یہاں چلے جاتے ہیں۔ اور وہاں اُن کو دیر ہو جاتی ہے۔ تو پھر گھر بھی نہیں آتے۔ میں جاتا ہوں۔ تو اُن کو مدرسے میں پاتا ہوں۔

باپ۔ کیا اپنے گھر میں جگہ نہیں ہے؟ کہ دوسروں کے یہاں جاتے ہیں؟

بیٹا۔ جگہ تو ہے۔ مگر وہ کہتے تھے کہ یہاں بڑے بھائی جان کے پاس ہر وقت گنجفہ اور شطرنج ہوا کرتا ہے۔ اطمینان

کے ساتھ پڑھنا نہیں ہو سکتا۔

باپ۔ تم بھی شطرنج کھیلنی جانتے ہو؟

بیٹا۔ مُہرے پہچانتا ہوں۔ چالیں جانتا ہوں۔ مگر کبھی خود کھیلنے کا اِتفاق نہیں ہوا۔

باپ۔ مگر زیادہ دنوں تک دیکھتے دیکھتے یقین ہے کہ تم بھی کھیلنے لگو گے۔

بیٹا۔ شاید مجکو عُمر بھر بھی شطرنج کھیلنی نہ آئے گی۔

باپ۔ کیون۔ کیا ایسی مشکل ہے؟

بیٹا۔ مشکل ہو یا نہ ہو۔ میرا جی نہیں لگتا۔

باپ۔ سبب؟

بیٹا۔ میں پسند نہیں کرتا۔

باپ۔ چونکہ مشکل ہے اکثر مبتدی گھبرایا کرتے ہیں۔ مجکو یقین ہے کہ گنجفہ میں تمھاری طبیعت خوب لگتی ہوگی۔ وہ بہ نسبت شطرنج کے بہت آسان ہے۔

بیٹا۔ میں شطرنج کی نسبت گنجفہ کو زیادہ ناپسند کرتا ہوں۔

باپ۔ ہاں شطرنج میں طبیعت پر زور پڑتا ہے اور گنجفہ میں حافظہ پر۔

بیٹا۔ میری ناپسندیدگی کا کچھ خاص کر یہی سبب نہیں ہے بلکہ مجھے سارے کھیل بُرے معلوم ہوتے ہیں۔

باپ۔ تمھاری اِس بات سے مجکو تعجب ہوتا ہے اور میں تم سے تمھاری ناپسندیدگی کا اصلی سبب پوچھنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ شاید اب سے پانچ یا چھ مہینے پہلے جن دِنوں مَیں باہر کے مکان میں بیٹھا کرتا تھا۔ مَیں نے خود تم کو ہر طرح کے کھیلوں میں نہایت شوق کے ساتھ شریک ہوتے دیکھا تھا۔

بیٹا۔ آپ دُرست فرماتے ہیں۔ مَیں ہمیشہ کھیل کے پیچھے دیوانہ بنا رہتا تھا۔ مگر اب تو مجکو ایک دِلی نفرت ہوگئی ہے۔

باپ۔ آخر اِسکا کوئی سبب خاص ہوگا۔

بیٹا۔ آپ نے اکثر چار لڑکوں کو کتابیں بغل میں دابے اندر گلی میں آتے جاتے دیکھا ہوگا +

باپ۔ وہی جو گورے گورے چار لڑکے ایک ساتھ رہتے ہیں۔ پھڈّی جوتیاں پہنے ہوئے۔ مُنڈے ہوئے سر۔ اونچے پائجامے۔ نیچی چولیاں۔

بیٹا۔ ہاں جناب! وہی چار لڑکے۔

باپ۔ پھر؟

بیٹا۔ بھلا آپ نے کبھی اُن کو کسی قسم کی شرارت کرتے دیکھا ہے؟

باپ۔ کبھی نہیں۔

بیٹا۔ جناب کچھ عجب عادت اُن لڑکوں کی ہے۔ راہ میں چلتے ہیں۔ تو گردن نیچی کیے ہوئے۔ اپنے سے بڑا مل جائے جان پہچان ہو یا نہ ہو۔ اُن کو سلام کر لینا ضرور۔ کئی برس سے اِس محلّہ میں رہتے ہیں۔ مگر کانوں کان خبر نہیں۔ محلّہ میں کوڑیوں لڑکے بھرے پڑے ہیں۔ لیکن اُن کو کسی سے کچھ واسطہ نہیں۔ آپس میں اور پرائے کے چاروں بھائی ہیں۔ نہ کبھی لڑتے۔ نہ جھگڑتے۔ نہ گالی بکتے۔ نہ قسم کھاتے۔ نہ جھوٹ

بولتے۔ نہ کسی کو چھیڑتے۔ نہ کسی پر آوازہ کستے ہمارے ہی مدرسے میں پڑھتے ہیں۔ وہاں بھی ان کا یہی حال ہے۔ کبھی کسی نے اُن کی جھوٹی شکایت بھی تو نہیں کی۔ ڈیڑھ بجے ایک گھنٹے کی چھٹی ہوا کرتی ہے۔ سب لڑکے تو کھیل کود میں لگجاتے ہیں اور یہ چاروں بھائی ایک پاس کی مسجد میں نماز پڑھنے چلے جاتے ہیں۔

باپ۔ بھلا پھر؟

بیٹا۔ منجھلا لڑکا میرا ہم جماعت ہے۔ ایک دن میرا آموختہ یاد نہ تھا۔ مولوی صاحب نہایت ناخوش ہوے اور اُس کی طرف اشارہ کرکے مجھ سے فرمایا کہ کمبخت! گھر سے گھر ملا ہے۔ اسی کے پاس جاکر یاد کرلیا کر۔ میں نے جو پوچھا کیوں صاحب! یاد کرا دیا کروگے؟ تو کہا بسروچشم۔ اگلے دن اُن کے گھر گیا۔ آواز دی۔ اُنھوں نے اندر بُلا لیا۔ دیکھا کہ ایک بہت بوڑھی سی عورت تخت پر جانماز بچھائے قبلہ رو بیٹھی ہوئی کچھ پڑھ رہی ہیں۔ وہ اُن لڑکوں کی نانی

ہیں۔ لوگ اُن کو حضرت بی کہتے ہیں۔ میں سیدھا دالان میں
اپنے ہم جماعت کے پاس جا بیٹھا جب حضرت بی اپنے پڑھنے سے
فارغ ہوئیں۔ تو اُنھوں نے مجھ سے کہا "بیٹا! گو تم نے مجکو
سلام نہیں کیا لیکن ضرور ہے کہ میں تم کو دُعا دوں۔ جیتے
رہو۔ عُمر دراز خدا نیک ہدایت دے۔" اُن کا یہ کہنا تھا کہ میں
غیرت کے مارے زمین میں گڑ گیا اور فوراً میں نے اُٹھ کر
نہایت ادب کے ساتھ سلام کیا۔ تب حضرت بی نے فرمایا کہ
"بیٹا بُرا مت ماننا۔ یہ بھلے مانسوں کا دستور ہے کہ اپنے سے
جو بڑا ہوتا ہے۔ اُس کو سلام کر لیا کرتے ہیں۔ اور میں تم کو
نہ ٹوکتی۔ لیکن چونکہ تم میرے بچّوں کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے ہو
اِس سبب سے مجکو جتا دینا ضرور تھا۔" اِس کے بعد حضرت بی
نے مجکو مٹھائی دی اور بڑا اصرار کر کے کھلائی۔ مُدّتوں
میں اُن کے گھر جاتا رہا۔ حضرت بی مجکو اپنے نواسوں کی
طرح چاہنے اور پیار کرنے لگیں۔ اور ہمیشہ مجکو نصیحت کیا کرتی
تھیں۔ تب ہی سے میرا دِل تمام کھیل کود کی باتوں سے ہٹ گیا

از مؤلف

سچ کی تاثیر

(۱) **ایک** شریف خاندان کا نوعمر لڑکا۔ علم و کمال حاصل کرنے کے شوق میں اپنے عزیز وطن کو چھوڑ دینے پر آمادہ ہے۔ وہ اپنی ضعیفہ ماں سے عرض کرتا ہے "اگر آپ اجازت دیں۔ تو میں ایک قافلے کے ساتھ سفر کرنا چاہتا ہوں۔ جو عنقریب ہمارے مُلک کی دارالسلطنت کو جانے والا ہے۔ کیونکہ مَیں سُنتا ہوں کہ اُس بڑے شہر میں ہر قسم کے کامل لوگ موجود ہیں۔ اور وہاں علم کا بڑا چرچا ہے"۔

(۲) اُس یتیم لڑکے کی یہ درخواست اگرچہ ماں کے دل کو غمگین کرنے والی تھی۔ لیکن اُس دانا ماں کی محبّت کا ولولہ عقل کے قابو سے باہر نہ تھا۔ اِس لیے وہ اپنے پیارے بچّے کی جُدائی کو علم کی دولت کے مقابلے میں گوارا کر سکتی تھی۔ چنانچہ اُس نے ہونہار بچّے کے اِس نیک خیال کو بہت پسند کیا۔ اور نہایت خوشی کے ساتھ اُس کی درخواست کو

منظور فرمایا۔

(۳) بزرگ ماں نے ضروری سامان سفر کا تیار کیا اور جب کہ قافلے کی روانگی کا وقت قریب آیا۔ تو چالیس روپے جن کا اُس عہد میں رواج تھا۔ لڑکے کو حوالے کیے۔ لیکن اِس نقدی کے علاوہ ایک اور چیز بھی عطا کی۔ جو کہ دنیا کے تمام جواہرات سے زیادہ بیش قیمت تھی۔ وہ نفیس چیز کان یا دریا سے نکلی ہوئی نہ تھی۔ بلکہ وہ نورانی دل کے سرچشمہ سے پیدا ہوئی تھی۔

(۴) وہ بے بہا چیز صرف یہ نصیحت تھی کہ "میرے پیارے بچے! ہمیشہ سچ بولیو۔ اپنے دل۔ زبان اور ہاتھ کو سچا رکھیو۔ کیسا ہی خوف وخطر پیش آئے۔ سچ پر ثابت قدم رہیو۔ اب تو مجھ سے عہد کر کہ ہمیشہ اِس نصیحت پر عمل کروں گا۔" سعادت مند لڑکے نے مہربان ماں کی باتیں بہت غور سے سُنیں اور سچے دل سے عہد کیا کہ "میں کسی حال میں اِس کے خلاف نہ کروں گا۔" یہ کہکر سلام رخصت کیا اور قافلہ کے ہمراہ بغداد کو روانہ ہوا۔

(۵) شاید قافلے نے دو تین ہی منزلیں طے کی تھیں کہ اُس کم عمر مسافر کی آزمایش کا وقت آپہونچا۔ ناگاہ قزاقوں کا ایک زبردست گروہ نمودار ہوا۔ اہل قافلہ اُنکا مقابلہ نہ کرسکے۔ ہر ایک شخص خوف زدہ اور بے قرار تھا۔ سوائے اُس لڑکے کے جس کو اپنی سچائی پر پورا اعتماد تھا۔ اُس کو یقین تھا کہ سچ مجکو ہر آفت سے بچائے گا اور سچائی کی تلوار کا وار کبھی خالی نہ جائے گا۔

(۶) جب قزاق ہر مسافر کی پوشیدہ نقدی طلب کر رہے تھے اور جو شخص کچھ حیلہ یا عذر کرتا تھا۔ وہ اُن کے بے رحم ہاتھوں سے بُری طرح ستایا جاتا تھا۔ ایک قزاق نے لڑکے سے سوال کیا کہ "جو کچھ تیرے پاس ہو بیان کر" لڑکے نے بے تأمل اپنے روپیوں کی تعداد بتادی۔ اس دلیرانہ سچے جواب نے قزاق کو دھوکے میں ڈال دیا اسی طرح چند قزاقوں نے پوچھا مگر اپنے رفیق کی طرح لڑکے کی طرف کسی نے توجہ نہ کی۔

(۷) آخر کار تمام قزّاق مالِ غنیمت اکٹھا کرنے کے لیے ایک مقام پر جمع ہوئے۔ اُس وقت اپنے سردار سے لڑکے کا ماجرا بیان کیا۔ اُس کو یہ بات ایسی عجیب معلوم ہوئی کہ فوراً اُس لڑکے کو طلب کر کے خود دریافت کرنے لگا۔ جب اُس نے معلوم کیا کہ وہ عجیب لڑکا اپنے عہد پر ایسا ثابت قدم ہے۔ اور اپنی مہربان ماں کے حکم کی ایسی تعظیم کرتا ہے تو سردار کی حالت میں ایک بڑی تبدیلی پیدا ہوئی۔

(۸) اُس سردار کو اپنے دل کے اندر سے ایک آواز آئی "او احمد الفی۔ کیا تجکو شرم نہیں آتی۔ کہ یہ بچہ اپنی ماں کے عہد پر قائم ہے۔ اور تو اُس بڑے مالک کے عہد کی بھی کچھ پروا نہیں کرتا۔ ناحق اُس کی خلقت کو ستاتا اور غارت کرتا ہے" اِس آواز کے سُنتے ہی قزّاقوں کے سردار نے اپنے ظالمانہ پیشے سے فوراً توبہ کی۔ اور اُسکے تمام رفیقوں نے بھی اُس کا ساتھ دیا۔

(۹) وہ تمام غارتگر جن کے سامنے لوٹ کے مال کا

انبار لگا ہوا تھا۔ یکایک ایسے رحم دل پارسا بن گئے کہ اُنھوں نے ہر ایک شخص کا مال واپس کر دیا۔ اور جن کو اذیّت پہونچائی تھی۔ اُن سے معافی چاہی۔ اور آیندہ تمام عمر نیکی کے ساتھ بسر کی۔

وہ سچّا لڑکا جس کے سچ کی ایسی تاثیر ظاہر ہوئی۔ آیندہ زندگی میں ایک بڑا بزرگ شخص ہوا ہے۔ جس کا نام آج تک زندہ ہے۔ اور وہ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے نام سے مشہور ہے۔

از مسٹر عنایت اللہ بی۔ اے علیگ
ایک ویران شہر پر بندروں کا قبضہ

زُلفی نے آج تک ہندوستان کا کوئی شہر نہیں دیکھا تھا۔ اِن ویرانوں پر نظر پڑی تو ہر چیز خوش نُما معلوم ہوئی کسی زمانے میں کوئی بڑا راجہ تھا۔ جس نے ایک پُر فضا سرسبز پہاڑی پر اِس شہر کو آباد کیا تھا۔ لیکن مدّت سے انسان کا وہاں گذر نہ رہا تھا۔ جنگل نے چاروں طرف سے

اُس کو گھیر لیا تھا۔ اور خودرو درختوں نے اُس کی شان دار عمارتوں کو چند روزہ حُسن دیکر غارت کرنا شروع کر دیا تھا۔ اکثر عالی شان محلوں کے کچھ کچھ حصّے باقی تھے۔ شہر کے اونچے اونچے دروازے شکستہ حال اب تک موجود اور بُرجیاں اُن پر قائم تھیں پختہ روشوں کے آثار کہیں کہیں دکھائی دیتے تھے۔ دیواریں جگہ جگہ سے ٹوٹی پڑی تھیں۔ جہاں سے پتّھر اُکھڑے تھے۔ وہیں کوئی جنگلی بیل یا خودرو درخت پھوٹ نکلا تھا۔ اور اُس کا ہریاول در و دیوار پر چھایا تھا۔ کہیں کہیں کسی شکستہ دیوار کے سائے اور درختوں کے جھُرمٹ نے مِل جُل کر تنہائی کے گوشے نہایت دلچسپ بنا دیے تھے۔ شہر پناہ کے کنگورے اور تھوڑی تھوڑی دور پر فصیلوں کے بُرج بھی شق ہو کر آدھے آدھے خندق میں پھسل پڑے تھے۔ بُرجوں کے سُتونوں پہ ہری ہری بیلیں لپٹی ہوئی تھیں۔ اور دریچوں میں سے جنگلی درختوں کی شاخیں باہر نکل کر

ہر وقت ہوا کے جھوکوں سے جھومتی تھیں۔ خندق میں کہیں کہیں برسات کا پانی بھرا تھا۔ اور اُسمیں چھوٹی چھوٹی مچھلیاں۔ پیاری جانیں اُچھل اُچھل کر چاندی کے پتّروں کی طرح چمکا کرتی تھیں۔ اور نہائے دھوئے جل کوّے صُبح سے شام تک اُن کے فراق میں پانی کے اوپر اوپر ہوا میں پھرکیوں کی طرح پھرا کرتے۔ دس پانچ ڈُبکیوں میں دو چار مچھلیوں نے پُوٹا بھر دیا۔ تو خوش ہو کر اُڑ جاتے کہ دوسرا پانی دیکھیں +

ویرانہ کے بیچوں بیچ پہاڑ کی چوٹی پر راجہ کا محل تھا چھت کبھی کی گر چکی تھی۔ فقط در و دیوار باقی تھے۔ محرابیں موجود تھیں۔ خشک نہر کے کنارے چوپڑ کا فرش اور سنگ مرمر کے فوّارے ٹوٹے پڑے تھے۔ درختوں کی جڑوں نے فرش کے پتھروں کو توڑ پھوڑ کر ناہموار کر دیا تھا اور سنگ مرمر کی سلوں پر سبز اور سُرخ داغ پڑ گئے تھے محل کے چبوترے پر مہتابی کے پاس کھڑے ہو کر دیکھو۔ تو

چاروں طرف کالی کالی دیواریں دکھائی دیتی تھیں چھت کسی مکان کی باقی نہ رہی تھی۔ پختہ سڑکوں کے کنارے جہاں اب گڑھوں میں پتھروں کے ڈھیر پڑے ہیں۔ یہ کسی وقت میں بڑے بڑے اندارے اور پن گھٹ تھے۔ یہاں پیاری پیاری لڑکیاں جن کے ہنسنے بولنے کے دن تھے۔ آپس میں چہلیں کرتی۔ پانی بھرا کرتی تھیں۔ چوراہے پر جو ایک بے ڈول سے پتھر کا ٹکڑا پڑا ہے۔ یہ کسی دیوتا کی مورتی تھی۔ جس پر روز صبح سویرے پھولوں کے ہار چڑھا کرتے تھے۔ وہ ٹوٹا برج جہاں پیپل کے بہت سے چھوٹے بڑے درخت اُگ آئے ہیں۔ جن کے پتے دھوپ میں چمک چمک کر ہوا کے جھوکوں سے تالیاں بجاتے ہیں۔ یہ اُس شہر کا عالیشان مندر تھا، یہاں صبح و شام سنکھ اور گھنٹے بجتے تھے۔ پوجاریوں کے میلے لگے رہتے تھے۔ مگر اب وہ صورتیں کہاں۔ نہ راج رہا۔ نہ پاٹ بستی کے بسنے اور بسانے والے سب خاک میں مل کر

خاک ہوگئے۔ اب تو یہ ایک ویرانہ ہے۔ اور اُس پر
بندروں کی حکومت کا ڈنکا رات دِن پڑا بجتا ہے بادہ
اِس شہر کو اپنا شہر مشہور کرتے۔ اور خود شہری بن کر
جنگل والوں کو دہقانی بتاتے ہیں۔ مگر آج تک اِن
مسخروں کی سمجھ میں یہ نہ آیا کہ یہ محل اور مکانات کس نے
بنائے تھے۔ اور کیوں بنائے تھے اور اُن میں کس طرح
رہنا چاہیے۔ مگر زُعم یہی تھا کہ ہم ہر بات میں انسان کی
نقل اُتار سکتے ہیں راجہ کے محل میں جہاں کبھی درباریوں
کا ہجوم رہتا تھا۔ سیکڑوں بندر ایک کے پیچھے ایک بیٹھ
جاتا۔ اور بجائے اِس کے کہ رُموزِ سلطنت پر سرگوشیاں
ہوں۔ ایک کی جُوئیں ایک دیکھ دیکھ کر کھاتا تھا۔ اور
اِس شغل میں اِس درجہ محو ہوتے کہ تھوڑی دیر میں
سب کا جی گھبرا اُٹھتا۔ اور فوراً آنکھ مچولی شروع ہو جاتی
بیس بیس تیس تیس بندروں کی ٹولیاں بندھ کر اِدھر گھس
اُدھر پیٹھ۔ دس بندر دالان میں گھُس۔ کمانچے میں آئے

ہیں۔ تو پانچ کما بچے سے اُچک شہ نشین پر پہونچے۔ ایک جوڑا تبھی پرے کو دبیچی کے طاق میں سردی کھاتا۔ تو دوسرا زینہ سے چڑھ سراپردہ سے برآمد ہو۔ تخت پر ناچ دکھاتا۔ اور اُس غریب بوڑھے بندر کو چھیڑتا۔ جو سائبان کے قلابے میں تنِ تنہا لٹکا بچے گودروں کی یاد میں مصروف ہے۔ غرض دس دس کے پیچھے بیس بیس اور بیس بیس کے پیچھے تیس تیس بندر تھا کہ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر بھاگ رہا ہے۔ کبھی کبھی بہت اہتمام سے چونے کے ٹکڑے دیواروں سے اُکھیڑ کر صدر کی جانب دیوان خاص کے گوشہ میں جمع کیے جاتے ہیں۔ کبھی صحن چبوترے کی اینٹیں نکال نکال کر اُن کے ڈھیر سنگ مرمر کے تخت پر چُنے جاتے ہیں۔ اور پھر اِس کثرت کار میں وقت حافظہ یک لخت معطل ہو جاتی ہے۔ اور یہ بھول کر کہ چونے اور اینٹوں کے خزانے کہاں جمع کیے تھے۔ تفتیش شروع ہوتی! اور دوران تفتیش میں خفیف سی رنجشیں پیدا! ہو کر دفعتاً اس زور کی لڑائی کھٹکتی

کہ سیکڑوں بندر لہو لہان ہو جاتا۔ اور بندریاں بچوّں کو
کلیجے سے لگا۔ دور جا بیٹھتیں۔ پھر کوئی خیال یکایک ایسا پیدا
ہوتا کہ تیس تیس، چالیس چالیس بندروں کی گروہ بندی
ہو جاتی۔ اور سب کے سب پائیں باغ میں جا کودتے۔
جہاں ابھی تک پھولوں اور میووں کے درخت خود رو
حالت میں پھولا پھلا کرتے تھے۔ ایک غول کنگروں
میں سے نکل کر ناشپاتیوں میں پہونچا۔ تو دوسرا امرودوں
سے نکل۔ کھجوروں کے جھنڈ میں جا کودا۔ ایک نے چمن
کی روش پر گلاب کے تختوں کو روند مارا۔ تو دوسرا
مخمل گھاس پر لوٹنے لگا۔ درختوں کو ہلا ہلا کر پھلوں کی
بوچھار پر ہنسیاں ہو رہی ہیں اور اُن کے ستھراؤ پر
قہقہے لگ رہے ہیں۔ باغ و چمن تو خیر اپنی جائداد تھے
محلوں میں بھی کوئی تہ خانہ۔ کوئی بھول بھلیاں۔ کوئی
تاریک سرنگ کا رستہ ایسا نہ تھا۔ جس کو اُنھوں نے
بار بار تحقیق نہ فرمایا ہو۔ لیکن خاک یاد نہ رہتا تھا کہ کونسی

چیزیں دیکھ چکے ہیں" اور کون سی دیکھنی باقی ہیں۔ اور پھر دو دو چار چار مل کر گردن میں باہیں ڈالے محلوں میں ٹہلتے پھرتے اور فخر کرتے کہ جس طرح آدمی یہاں آباد تھے۔ اور اپنے کاروبار میں مصروف رہتے تھے۔ اسی طرح ہم بھی اس شہر میں آباد ہوئے ہیں + پختہ تالابوں اور سنگ مرمر کے پاکیزہ حوضوں سے پانی پیتے۔ اور تھوڑی دیر میں نرمل جل کو گندہ کر کے کیچڑ کر دیتے۔ اور پھر پانی پر لڑائیاں ہوتیں۔ جو خشکی کی لڑائیوں سے ہرگز کم نہ تھیں۔ اور ابھی ان لڑائیوں کا کوئی نتیجہ نہ نکلتا تھا کہ اپنی تعریفوں کے گیت شروع ہو جاتے۔ قصیدہ پر قصیدہ پڑھا جاتا۔ کلام میں اس بلا کی شورش ہوتی تھی کہ چیختے چیختے آوازیں بیٹھ جاتیں۔ اور ممدوحین کی چند یا مداحیں کے پنجوں کی داد دیتے دیتے گنجی ہو جاتی تھی۔ اور پھر یہی سب حرکتیں۔ اور اُن کے متعلق مضامین از سر نو شروع ہو جاتے +۔

از مؤلف
معاش

(۱) اپنے اور اپنے اہل وعیال کے واسطے کمانا اور معاش پیدا کرنا بھی انسان کی نیکیوں میں سے ایک بڑی نیکی ہے۔ اور باوجود طاقت و قدرت کے دوسروں کا محتاج بننا ایک گناہ ہے۔ اس لیے ہر شخص پر واجب ہے کہ وہ معاش پیدا کرنے کے لیے کوئی پیشہ اختیار کرے۔

(۲) وہ پیشے جن سے معاش حاصل ہوتی ہے۔ بعض ضروری ہیں۔ جیسے زراعت۔ تجارت۔ کان کھودنا۔ آہنگری۔ نجاری وغیرہ۔ کیونکہ ان پیشوں کے ذریعہ سے انسانوں میں تہذیب پھیلتی اور اُن کی زندگی راحت و آرام سے بسر ہوتی ہے۔

(۳) بعض پیشے غیر ضروری ہیں۔ جیسے زرگری۔ بازی گری۔ نقالی۔ مسخرا پن وغیرہ۔ کیونکہ یہ پیشے صرف

عیش و نشاط کے لیے ہیں۔ زندگی کی کوئی ضرورت ان پیشوں پر منحصر نہیں۔ بعض پیشے بالکل مصلحتِ عام کے خلاف ہیں۔ کیونکہ اُن کا کرنے والا نہ خود معاش پیدا کرتا۔ نہ اوروں کو مدد دیتا ہے جیسے قمار بازی۔ جھوٹی گواہی۔ چوری۔ قزاقی وغیرہ۔

(۴) اعلیٰ پیشے وہ سمجھے جاتے ہیں۔ جو دانائی اور شجاعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ جیسے انتظام۔ عدالت تعلیم طب۔ حساب۔ کتاب۔ مساحت۔ سپاہ گری وغیرہ۔ ادنیٰ پیشے وہ ہیں۔ جو صرف جسمانی طاقت پر موقوف ہیں جیسے بوجھ اُٹھانا۔ لکڑیاں چیرنا۔ مٹی کھودنا وغیرہ۔ مکروہ پیشے وہ ہیں جن کے کرنے سے طبیعت کو نفرت ہوتی ہے۔ جیسے خاکروبی وغیرہ

(۵) جو لوگ اعلیٰ درجے کی لیاقت حاصل کرتے ہیں وہی اعلیٰ پیشے اختیار کر سکتے ہیں۔ جو کم لیاقت ہوتے ہیں۔ اُنکو مجبوراً کوئی ادنیٰ پیشہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ جو شریف آدمی ہیں وہ جائز پیشہ اختیار کرتے ہیں خواہ ادنیٰ ہو۔ خواہ اعلیٰ۔ وہی نیک معاش کہلاتے

ہیں۔ جو لوگ پاجی اور کمینے ہیں۔ وہ ناجائز پیشے کرتے ہیں۔ جیسے چوری۔ جُوا وغیرہ۔ وہی بدمعاش کہلاتے ہیں۔

(۶) انسان کو لازم ہے۔ کہ جائز پیشے اختیار کرے۔ اور جو پیشہ اختیار کرے۔ اُس میں کامل ہونے اور اُستاد بننے کی کوشش کرے۔ کیونکہ ناقص اور بے ہنر آدمی کی محنت بہت ضائع ہوتی ہے۔ وہ بہت سا وقت کھو کر تھوڑا کماتا ہے۔ کامل اور باہنر آدمی تھوڑے وقت میں زیادہ اُجرت پاتا ہے **مؤلف**

کوئی پیشہ ہو زراعت یا تجارت یا کہ علم
چاہیے انسان کو حاصل کرے اُس میں کمال
کاملوں کی عُمر بڑھ جاتی ہے خود کرلو حساب
باہُنر کا ایک دن۔ اور بے ہنر کا ایک سال

(۷) ہر ایک پیشہ میں سچّائی۔ راست بازی اور ایمان داری سے نفع حاصل ہوتا ہے۔ دغا۔ فریب۔ چالاکی طراری کا انجام ہمیشہ نقصان ہے۔ کیونکہ دُنیا میں اکثر

کام ایک دوسرے کے اعتبار پر چلتے ہیں۔ اور جو ایک بار دغا کرتا ہے۔ اُس کا اعتبار نہیں رہتا۔ اور جس کا اعتبار نہیں وہ کھوٹا پیسہ ہے۔ جو بغیر بٹّے کے ہرگز نہ چلے گا۔ یا کاٹ کی ہنڈیا یا کاغذ کی ناؤ ہے۔ جو ایک بار کے سوا کام نہ دے گی۔ جو شخص اپنے نفع کے واسطے دوسرے کو خسارہ دیتا ہے۔ وہ حقیقت میں خود خسارہ پاتا ہے۔

(۸) کاری گروں کو چاہیے۔ کہ لوگوں کو دھوکے میں ڈالنے کی نیّت سے کھوٹی چیزیں نہ بنائیں۔ تاجروں کا فرض ہے کہ اپنے مال کی جھوٹی تعریف نہ کریں۔ جو عیب و نقص اُن کو معلوم ہو۔ خریدار کو جتا دیں۔ کم تولنا کم ناپنا فریب دینے کی غرض سے چیزوں میں آمیزش کرنا سخت گناہ ہے۔ خریدار کو لازم ہے۔ کہ سودے کی دیکھ بھال ہوشیاری سے کرلے۔ نرخ کے چکانے میں اُس کو حُجّت کرنے کا اختیار ہے۔ مگر جو ٹھہر گیا ہو۔ اُس سے زیادہ چاہنا یا داموں میں کمی کرنا یا کھوٹے دام دینا

یا سیکھنے والے کو دھمکانا نہایت کمینہ پن ہے۔ **مؤلف**

راستی سیدھی سڑک ہے جس میں کچھ کھٹکا نہیں
کوئی رہرو آج تک اس راہ میں بھٹکا نہیں

از مؤلف

دلیری

(۱) جس وقت کوئی خطرہ یا دشواری پیش آئے یا آفت و مصیبت کا سامنا ہو۔ اگر اُس وقت انسان اپنی ذات پر بھروسہ کرے۔ اور اپنی رائے اور تدبیر سے اُن خطروں اور آفتوں کے دفع کرنے پر آمادہ ہو۔ تو اس خصلت کو دلیری کہتے ہیں۔

(۲) دلیری سے ثابت قدمی اور استقلال پیدا ہوتا ہے۔ استقلال کے وسیلے سے مشکلیں آسان ہوتی ہیں۔ جس کام کو آدمی شروع کرتا ہے۔ اُس کو تمام کرکے چھوڑتا ہے۔ دلیری انسان کو بڑے بڑے کاموں کا

حوصلہ دلاتی اور کامیابی کی راہیں سُجھاتی ہے۔ دلیری ہی وہ چیز ہے۔ جو آدمی کو ادنیٰ درجے سے اعلیٰ رتبے پر پہونچاتی ہے۔

(۳) دلیری دشمنوں کے حملے ظالموں کے ظُلم اور شریروں کی شرارت سے بچاتی ہے۔ دلیری ہی سے انسان اپنے نفع۔ اپنے حق اور اپنی عزّت و حُرمت کی حفاظت کرتا ہے۔ دلیری سے صبر و تحمّل پیدا ہوتا ہے۔ جو آدمی کو مصیبتوں پر غالب اور فتح مند بنا دیتا ہے۔

(۴) شاید تم نے دیکھا ہو کہ انجن کے نیچے آگ جلاتے ہیں جس سے بھاپ بنتی ہے۔ بھاپ کی روک تھام سے باقاعدہ حرکت پیدا ہوتی ہے اِس حرکت سے بڑے بڑے کام نکلتے ہیں۔ اِسی طرح غصّہ آدمی کے دل میں ایک طاقت پیدا کرتا ہے جب عقل اِس طاقت کو اپنے قابو میں رکھتی ہے۔ تو آدمی سے دلیری کی خصلت ظاہر ہوتی ہے۔

(۵) جب غصّہ حد سے زیادہ بڑھتا ہے۔ تو عقل سلامت

نہیں رہتی۔ انجام کا فکر اور نیک و بد کی تمیز اُٹھ جاتی ہے۔ اِس جوش میں وہ ایسی نا معقول حرکتیں کر بیٹھتا ہے کہ غُصّہ فرو ہونے کے بعد اُس کو خود ندامت ہوتی ہے بدلہ اور اِنتقام کا خوف دل پر چھا جاتا ہے ایسے آدمی سے دوست، آشنا، نفرت کرنے لگتے ہیں۔ دشمن اُس کی بیہودگی پر ہنستے اور خوش ہوتے ہیں +

(۶) غُصّے کی حرارت کا بالکل مرجانا بھی بُرا ہے۔ جب یہ حرارت آدمی کے دل کو نہیں اُبھارتی۔ تو وہ بودا۔ ڈرپوک۔ کم ہمّت۔ سُست اور بے غیرت بن جاتا ہے اگر دُشمن اُس کی حق تلفی یا ہتک کرے۔ تو وہ ذِلّت کے ساتھ گوارا کرتا ہے۔ کوئی آفت یا خطرہ سامنے آئے۔ تو اُس کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ ایسا آدمی کسی دشوار کام کو انجام نہیں دے سکتا۔ اِس لیے وہ انسانیت کی تمام خوبیوں سے محروم رہتا ہے +

نہ حلوا بن کہ چٹ کر جائیں بھوکے نہ کڑوا بن کہ جو چکھے سو تھوکے

از شمس العلما خان بہادر مولوی ذکاء اللہ
(باتیں گھڑنی)

باتیں۔ بڑے آدمیوں کے دل بہلانے کے لیے، ایسے ہی اوزار ہیں، جیسے بچوں کے دل بہلانے کے لیے کھلونے مگر آج کل ہم میں بُری باتوں سے دل بہلانے کی عادت ہو گئی ہے۔ ہمارے پیچھے یہ مرض ایسا لگ گیا ہے کہ خواہ ہم اپنا حال بیان کریں یا کسی دوسرے کا جس میں ہماری کوئی غرض بھی نہ ہو، تو کوئی اُس کا اعتبار نہیں کرتا۔ شاید تھوڑے ہی آدمی ہوں گے کہ جن کی باتوں پر لوگوں کو یقین ہوتا ہو، اور وہ یقین کے قابل بھی ہوں +

ساری بداخلاقیوں کی جڑ یہ ہے کہ ہمارے کلام میں سے سچائی رخصت ہو گئی۔ ہر نیکی کی ابتدا سچ ہی سے ہوتی ہے۔ اب سچ بولنا اِس کا نام رہ گیا ہے کہ ہم باتیں بنا بنا کر دوسرے آدمی کو اپنے سچ بولنے کا یقین کرا دیں۔ کھوٹے سکّے چالاکی سے

چلا کر کھڑے سکوں میں گنوا دیں۔ جھوٹ بولنا۔ قسم کھانا
کوئی بُرا نہیں جانتا۔ بلکہ حسن کلام میں داخل ہیں۔ بات
کے بیان کرنے میں نفس الامری واقعات پر
خیال نہیں کرتے۔ بلکہ جس طرح اپنے تئیں اُس کا بیان
اچھا معلوم ہو یا سمجھیں کہ اس طرح بیان کرنا اوروں کو
اچھا معلوم ہوگا۔ اُسی طرح بیان کرتے ہیں، اور اُس کا
نام حسنِ بیان رکھتے ہیں۔ غرض ریاکاری اور مکاری
کے ساتھ باتیں بنانا، ہماری عادت میں داخل ہے۔ اور
وہ عیب کی جگہ ہنر سمجھا جاتا ہے۔ کوئی گالی اور دشنام اور
بُرا لفظ، اِس سے بڑھکر نہیں ہے کہ کوئی تم کو جھوٹا کہے ہر
مذہب، کسی بُرائی پر ایسی لعنت ملامت نہیں کرتا جیسے
کہ جھوٹ بولنے پر۔ مگر رواج نے ان دونوں باتوں کا اثر
دل پر اتنا بھی باقی نہیں رکھا۔ جتنی اُردو پر سفیدی +
ایک حکیم کیا خوب کہتا ہے کہ جھوٹ بولنا اور آدمیوں
سے ڈرنا۔ خدا کی تحقیر کرنا ہے + خدا کا حکم ہے کہ جھوٹ

مت بول، جب یہ حکم نہ مانا تو اُس کے حکم کی تذلیل ہوئی
بس اس سے زیادہ کون سی انسان کی ذلیل اور
خوار کرنے والی بڑائی ہوگی کہ جس کے سبب سے وہ آدمیوں
سے تو ڈرے، اور خدائے تعالیٰ سے بہادری کرے۔

ہماری باتیں ہی ہمارے دل کی ترجمان ہیں، صرف
انھیں کے ذریعے سے ہم خیالات کو دوسرے تک پہونچا سکتے
ہیں۔ اپنے ارادوں اور نیتوں کو ظاہر کر سکتے ہیں،
پس جب وہی جھوٹے ہوئے۔ تو گویا ہم اپنے بنی نوع کو
فریب دیتے ہیں، اور اُن سے اپنے تعلقات کے رشتوں
کو توڑتے ہیں، اپنے تمام خط و کتابت کا، گورنمنٹ کے
کاموں کی ذمہ داری کا، اعتبار کھوتے ہیں ہم سے تو
وہ وحشی قومیں اچھی ہیں کہ جب وہ جھوٹ بولتے ہیں یا
جھوٹی بات سنتے ہیں، تو اپنی زبان اور کان کا خون،
کفّارہ میں ہتوں پر چڑھاتے ہیں، اور جھوٹ سے توبہ
کرتے ہیں، مگر یہاں تو جیسے آہن گر لوہے کو زرگر سونے کو

گھڑ گھڑ کر کچھ سے کچھ بنا دیتا ہے۔ اسی طرح ہم باتونی باتوں کا بتنگڑ بنا کے کچھ سے کچھ کر دیتے ہیں۔

از مؤلّف

پھر کوشش کرو

(۱) ذہن اور حافظہ دماغی قوتیں ہیں۔ بعض دماغ قدرت نے ایسے بنائے ہیں کہ اُن میں یہ قوتیں تیز ہوتی ہیں۔ اور بعض میں مدّھم۔ جس کا ذہن تیز ہوتا ہے وہ بات کو جھٹ پٹ سمجھ سکتا ہے۔ جس کا حافظہ قوی ہوتا ہے وہ فوراً یاد کر لیتا ہے۔ اور دیر تک یاد رکھ سکتا ہے۔

(۲) ذہن و حافظے کی خوبی ایک خداداد نعمت ہے مگر جب تک کہ انسان اس نعمت کا شکر ادا نہیں کرتا کوئی فائدہ اس سے حاصل نہیں کر سکتا۔ اُس کا شکر محنت اور کوشش ہے۔ دیکھو۔ ایک چالاک گھوڑا ایک میل کا سفر بھی طے نہیں کرتا۔ جب تک کہ تھان پہ بندھا ہے۔ ایک

عُمدہ بُرزوں کی گھڑی ہرگز وقت نہیں بتاتی جب تک کوکی نہیں جاتی۔ ایک تیز رو کشتی دریا کے اُس کنارے کبھی نہیں پہونچتی جب تک اپنے مقام سے حرکت نہیں کرتی۔ یہی حال ذہن اور حافظے کا ہے۔ وہ کیسا ہی اچھا ہو مگر بدون کوشش و محنت کے کچھ سود مند نہیں۔

(۳) ایک معمولی ذہن اور حافظے کا آدمی اگر پورے طور سے برابر کوشش کیے جائے۔ تو وہ ترقی کی دوڑ میں اچھّے ذہن اور حافظے والوں سے پیچھے نہیں رہتا۔ لیکن بڑی بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ جن کو خدا نے اچھّا ذہن اور حافظہ عطا کیا ہے۔ وہ اکثر اپنی تیزی کے غرور میں کافی محنت اور پوری کوشش نہیں کرتے۔ اِسی سبب سے وہ مات کھا جاتے ہیں۔ مگر جو محنت ہی کو راحت سمجھتے ہیں اور اپنے کام کی دُھن میں لگے رہتے ہیں۔ وہ کیسے ہی غبی ہوں پھر بھی بازی جیت لیتے ہیں۔

(۴) آؤ ایک صحیح صحیح قصّہ سُنائیں جس کو سُن کر تم خود

سمجھ لوگے کہ کوشش کے ذریعے سے ایک غبی لڑکا اپنے مدرسے میں کیونکر نامور ہو گیا۔ وہ قصّہ یہ ہے:-

(۵) کسی قصبے کے مدرسے میں ایک لڑکا تھا۔ نہایت غبی۔ نہایت کُند ذہن۔ اُس کو آموختہ کبھی یاد نہیں رہتا تھا۔ وہ عادت خصلت کا بُرا نہ تھا۔ کھلاڑی اور شریر بھی نہ تھا۔ بدشوق بھی نہ تھا البتہ اپنے ذہن اور حافظے کی کمی کو پُورا کرنے کا طریقہ نہیں جانتا تھا۔ اِسی سبب سے وہ نہایت رنجیدہ اور بے دل رہتا تھا۔

(۶) شاید ہی کوئی روز ایسا ہوتا ہو کہ اُس کو اُستاد کی ناراضی سے شرمندہ ہونا نہ پڑتا ہو۔ یہ ایک ایسی ذِلّت تھی کہ وہ اپنے ہم جماعت لڑکوں سے بھی ہر وقت جھیپتا تھا یہاں تک کہ اُس کو کھیل کے گھنٹے میں اَور لڑکوں کی سی خوشی اور دل لگی ہرگز نصیب نہیں ہوتی تھی۔ روز بروز اُس کی نا اُمیدی بڑھتی جاتی تھی۔ اور وہ اکثر یوں خیال کرتا تھا کہ "غالبًا خدا نے مجھ کو لکھنے پڑھنے کے واسطے

پیدا نہیں کیا۔

(۷) ایک روز صُبح سویرے مکتب میں حاضر ہوا۔ اگرچہ اُس کے حق میں یہ صُبح سب سے زیادہ سخت اور ہولناک تھی۔ مگر خُدا کی مرضی یوں تھی۔ کہ یہی صُبح اُس کی خوش نصیبی کی پہلی صُبح ہوگی ۔ آج اُس کو آموختہ بالکل یاد نہ تھا۔ اُستاد نے جتنے سوال کیے اُن میں سے ایک کا بھی صحیح جواب نہ دے سکا۔ جب کام ختم ہوا تو اُستاد نے معمول سے زیادہ غیرت دلائی۔ اور صاف کہدیا کہ "اگر تُم خوب کوشش نہ کروگے تو مجکو اندیشہ ہے کہ تُم دُنیا میں کسی کام کے قابل نہ بن سکو گے"۔

(۸) وہ لڑکا یہ باتیں سُن کر نہایت غم زدہ سا ایک طرف جا بیٹھا۔ اور اوپری دل سے اُس بھُولے ہوئے سبق کو پھر دیکھنے لگا۔ کیونکہ اُس کے دل پر سخت صدمہ تھا۔ تمام بدن پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ نہایت مایُوس ہو کر اپنے ہم سبق سے جو اُس کے قریب بیٹھا تھا چُپکے چُپکے کہنے لگا۔

"کیا کوشش کروں! مجکو یاد تو رہتا ہی نہیں۔ شاید پڑھنا میرے مقسوم میں نہیں۔"

(۹) اُس کے ہم سبق نے کہا۔ "بھائی جان! یاد نہیں رہتا۔ تو کچھ مُضائقہ نہیں کوشش کرو اور پھر کرو۔ مگر خُدا کے واسطے ہمّت نہ ہارو۔" لڑکے نے جواب دیا "صاحب! کوشش تو کرتا ہوں۔ مگر سب اکارت ہو جاتی ہے۔ اب اس کے سوا کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ پڑھنا چھوڑ دوں۔" اُس کے نیک دل ہم سبق نے پھر نرمی اور مہربانی سے کہا۔ "اے عزیز! جُو ہو سو ہو ایک بار تو اَور کوشش کر دیکھ۔"

(۱۰) اگرچہ اُس غبی لڑکے کا دل ٹوٹ گیا تھا۔ مگر مہربان ہمنشین کی اِس صدا نے کہ "پھر کوشش کرو۔ پھر کوشش کرو" اُس کی ہمّت بندھائی۔ اب وہ ایک بار اور کوشش کرنے پر مُستعد ہو گیا۔ رفتہ رفتہ اُس نے معلوم کیا کہ الفاظ اور فقرے ذہن نشین ہونے لگے۔ پھر تو اُس کی ہمّت بڑھ گئی اور تھوڑی دیر میں سارا سبق از بر کر لیا۔

(۱۱) وہ اِس کامیابی سے ایسا بشاش ہوا کہ گویا اُس نے ایک بڑا بھاری خزانہ پا لیا۔ اُس کو زیادہ خوشی اِس بات کی تھی کہ میں آیندہ بھی اپنے ہر ایک سبق کو اِسی طرح جی لگا کر کوشش کروں گا تو یاد کر سکونگا وہ جلدی سے اُٹھا اور بہت ادب کے ساتھ اُستاد کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

(۱۲) **اُستاد**۔ اب کیا چاہتے ہو؟

لڑکا۔ جناب میں چاہتا ہوں کہ مہربانی فرماکر میرا سبق پھر سُن لیجیے۔

اُستاد۔ تم کس برتے پر درخواست کرتے ہو۔ آدھ گھنٹہ بھی تو نہیں گذرا کہ تم سُنانے کھڑے ہوے تھے۔ مگر ایک لفظ بھی نہ سُنا سکے۔

لڑکا۔ بے شک جناب! اُس وقت مجکو یاد نہ تھا مگر اب تو خُدا کے فضل سے میں اچھی طرح سُنا سکتا ہوں۔ اور اُمید ہے کہ آپ جو کچھ دریافت فرمائیں گے

اُس کا ٹھیک جواب دے سکوں گا۔

اُستاد۔ خیر سُناؤ۔

(۱۳) لڑکے نے تمام سبق اِس سِرے سے اُس سِرے تک فرفر سُنا دیا اور سب ٹھیک سُنایا۔ نہ کچھ بھُولا نہ کہیں رُکا۔ جو بات پوچھی گئی۔ اُس کا معقول جواب دیا۔ اُستاد نے بہت خوشی ظاہر کی۔ اور کہا کہ "اگر اِسی طرح آیندہ بھی کوشش کروگے۔ تو میں اُمّید کرتا ہوں کہ تم ایک لائق طالب علم بن جاؤ گے"۔ پھر تو اُس کا یہ حال ہو گیا کہ مدرسہ بھر میں کوئی لڑکا ایسا نہ تھا۔ جو اُس سے بہتر سبق یاد کرکے لاتا ہو۔

از سدرشن کا میلہ

(سوامی جی کا پہلا سفر)

ایک بار چلتے پھرتے نربدا ندی کی گھاٹی میں اتفاق سفر ہوا۔ صُبح کا سُہانا وقت تھا، بسنت رُت،

موسمِ خوشگوار، ہَوا میں اِعتدال، پھر دریا کا کنارہ اور قُدرتی باغ و بہار کا نظّارہ، جا بجا چھوٹی چھوٹی خوش نُما پہاڑیاں سبزے اور بیل بوٹوں سے لدی، گویا سبز پَری بنی کھڑی تھیں۔ اِس اِنتظار میں کہ آفتاب اپنی کرنوں کے سنہری موباف سے اُن کی چوٹیاں گوندھے پہاڑیوں کے دامن میں اونچے اونچے تناور درخت، گویا بَن کے پتشوی صفیں باندھے، پتھریلے دریا کے پانی کی سُریلی صدائیں۔ نہایت شوق سے کان لگائے سُنتے اور کبھی وجد میں آکر سر دُھنتے تھے، جب مشرقی اُفق پر سُرخی چھائی، اور نگارِ آتشیں رُخسار کے نقاب اُلٹنے کا وقت قریب آیا، تو درختوں پر بھانت بھانت کے پرندوں کا جمگھٹ ہو گیا، مختلف سُروں میں چہچہانے اور مبارک سلامت کے نغمے گانے لگے؛ بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے فرنگی ارگن کے سب پردے ایک ساتھ چھیڑ دیے ہیں ہَوا کے نرم نرم جھوکوں کے ساتھ جنگل کے رنگا رنگ

پھولوں اور پتّیوں کی خوشبو بھک بھک آرہی تھی، گویا عطّارِ قدرت نے عطرِ مجموعہ کا قرابہ کھول دیا تھا، جس کی مہک سے روح راحت پاتی تھی، میں اِس عالمِ نشاط میں جھومتا جھامتا مستانہ وار چلا جارہا تھا، اور کُل حواس اپنے اپنے مرغوباتِ لطیف سے محظوظ تھے۔ البتہ بیچاری زبان ہی محروم تھی، اِسی واسطے وہ اِس سرور کے بیان سے قاصر ہے ٭

غرض چلتے چلتے دوپہر ہونے کو آیا تو میں دریا کے کنارے ایک سُہاونی جگہ بیٹھ گیا، کپڑے اُتار کے اشنان کیا، اور کچھ پکّے پکّے پھل آس پاس کے درختوں سے توڑکر کھا لیے اور پھر بھر آرام کرکے پھر چل پڑا جب غروبِ آفتاب کا وقت قریب آیا، تو مجکو شب گذاری کا فکر ہوا اتفاق سے ایک شخص نظر آیا، میں نے اُس سے پوچھا "کیوں میاں؟ اِس جنگل میں کوئی مقام ایسا بھی ہے جہاں رات کو بسرام کرنے کا ٹھکانا مِل سکے"۔ بولا "جی ہاں"

بہت عمدہ جگہ آپ کو مل جائے گی۔ یہاں سے تھوڑی دُور آگے چل کر سدھ بابا کی منڈھی ہے۔ بہت اچھے فقیر ہیں اور بڑے دیالو بس اُن کے پاس جا ٹھہرو، بہت آرام پاؤ گے"۔ یہ سُنتے ہی میں نے قدم بڑھایا۔ اور ذرا دیر میں ایک چھوٹی پہاڑی کے پاس جا پہونچا، جو دریا کے عین کنارے پر تھی؛ اور پانی اِس سے ٹکرا کر گذرتا تھا میں اُس کے بیان سے سمجھ گیا کہ سدھ بابا کی منڈھی یہیں ہوگی۔ مگر وہ پہاڑی گھنے درختوں سے ایسی ڈھکی ہوئی تھی کہ نہ اوپر کی کچھ کیفیت نظر آتی تھی، نہ چڑھنے کو رستہ ملتا تھا ناچار درختوں کی ڈالیاں پکڑ پکڑ کر بدقت تمام اوپر پہونچا تو اُس کنج عافیت کو دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا، چوٹی پر ایک وسیع چبوترہ ہے، نہایت صاف ستھرا، ہموار، جس کو تین طرف سے درختوں نے گھیر رکھا ہے۔ اور ایک سمت دریا کی سیر کے لئے کھُلی ہے اُس کے مقابل دو خوشنما کُٹیاں بنی ہوئی ہیں۔ کھُلی جانب چبوترہ کے کنارے ایک چٹائی پر

بیٹھے سِدھ بابا دریا کی سیر دیکھ رہے تھے۔ میں جو یکایک جا پہونچا۔ تو نہایت مہربانی سے پیش آئے، بیٹھنے کا اشارہ کیا، اور آنے کا سبب پوچھا۔ میں نے پرنام کے بعد عرض کیا کہ" باباجی! مَیں ایک مُسافر ہوں اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو میں چاہتا ہوں کہ رات کو آپ کے پاس قیام کروں صُبح اُٹھ کر اپنا رستہ لوں" مُسکرا کر کہنے لگے" اجی مجھ کو تکلیف کیسی! میں بھی تم جیسا ایک مُسافر ہوں، شوق سے ٹھہرو ع خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو"
کچھ دیر باتیں کرتے رہے، پھر اُٹھے اور اپنی کُٹی میں سے چند پھل اور دُھونی میں سے کچھ جڑیں نکال کر میرے سامنے لا رکھیں۔ اور فرمایا" یہ کھاؤ" میں نے جو اُن چیزوں کو کھایا، تو حیران رہ گیا، کیونکہ ایسا ذائقہ عُمر بھر کسی کھانے میں نہ پایا تھا۔ میں کھا پی کر فارغ ہوا، تو باباجی پھر باتیں کرنے لگے۔ وہ بھی عجیب سماں تھا، دریا شیریں ادا سے آہستہ آہستہ بہ رہا، میدان میں دودھ سی چاندنی

چھٹکی ہوئی، درختوں سے چھن چھن کر نور برس رہا، ہوا سرد اور معطر چل رہی۔ چاروں طرف خموشی چھائی ہوئی سُنسان اور ہُو کا مکان یہ ایسا دلکش نظارہ تھا کہ آسمان کے چند ستارے بھی ٹکٹکی باندھے، اُسی کو دیکھ رہے تھے جب زیادہ رات گئی، تو بابا جی نے فرمایا "لو اب آرام کرو" ایک کُٹّی کی طرف مجکو اشارہ کیا، دوسری میں آپ چلے گئے۔

کوئی پہر رات رہے میری آنکھ کھُلی، تو اُٹھ بیٹھا اور کُٹّی سے باہر نکل آیا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ایک بڑا شیر چبوترہ پر بیٹھا دُم ہلا رہا ہے، اُس نے محبّت کی نگاہ سے میری طرف دیکھا۔ میں نے بھی اُس کو پیار کیا اور تھپکا جس طرح آگ کے پاس جانے سے اجسام میں حرارت آجاتی ہے، اسی طرح سچّے پریم کی محبّت جان داروں میں اُلفت پیدا کر دیتی ہے، یہ سدھ بابا کی محبّت صادق کا اثر تھا کہ اُس نواح کے کُل ساکنین کے دل دُشمنی سے پاک اور دوستی سے

معمور تھے۔ پھر میں دیر تک اُس چاندنی میں چبوترہ پر ٹہلتا رہا جب صبح ہوئی پو پھٹی تو وہ شیر اُٹھ کر چُپ چاپ چل دیا۔ اتنے میں سدھ بابا بھی اپنی کٹی سے نکل آئے تو میں نے چلنے کی پروانگی چاہی، ذرا تامل کر کے بولے "آج تو اور ٹھہرو۔ کل جانا"۔ یہ کہکر بیٹھ گئے اور پُرانوں کے دلچسپ ونصیحت آمیز قصّے سُناتے رہے، یہاں تک کہ دوپہر ہونے کے قریب آیا، اُس وقت فرمایا "آؤ، دریا کا اشنان کر آئیں" وہاں سے اُٹھ دریا کے کنارے پہونچے، تو بابا جی نے رنگا رنگ کی پتھریاں چُن چُن کر مجھے دکھائیں، کیسی سُڈول، خوش نما، خوش رنگ کہ جن کے دیکھنے سے جی نہ بھرتا تھا۔ کسی میں سنگ موسیٰ کی سی نمگی سیاہی، کوئی بلّور جیسی سفید چمکیلی، کسی میں عقیق کی سی ڈھڈھی سُرخی، پھر اُن میں زُنّار کی طرح سُفید دھاریاں پڑی ہوئیں، بعض میں کئی کئی رنگ نمودار، غرض قدرت کی صنّاعیوں کا عجب نمونہ تھا۔ بابا جی نے یہ بھی فرمایا کہ اِس نربدا ندی کے کنارے ایک ایسا

مقام ہے، جہاں درختوں میں سے گذر کر آفتاب کی شعاعیں پانی کی سطح پر پڑتی اور تہ آب کے پتھروں میں ان درختوں کا عکس پیدا کر دیتی ہیں، یہ قدرتی تصاویر ایسی خوب ہوتی ہیں کہ ہندوستان سے دور دست ولایتوں کو بطور نمونۂ عجائبات بھیجی جاتی ہیں۔ کنڈکی ندی میں ایک مقام پر سالگرام کی مورتیں نکلتی ہیں۔ جن کو اطراف ہندوستان میں لوگ پوجا کی غرض سے لے جاتے ہیں۔ بعض قسم کے پتھر بطور دوا استعمال کیے جاتے ہیں۔ اکثر قیمتی پتھروں کو جیسے ہیرا، پنا، لعل، عقیق وغیرہ آدمی بطور زیور کام میں لاتے ہیں، اصل تو یہ ہے کہ علم باعث راحت ہے اور جہل موجب کلفت۔ ہاں! غور کرنے والے غور کریں، تو انھیں سنگریزوں میں اُس قدرت کاملہ کے کمالات کا جلوہ دیکھ سکتے ہیں، جو تمام عالم کو ترتیب مناسب سے چلا رہی ہے

ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا
موسیٰ نہیں کہ سیر[1] کریں کوہِ طور کا

---

[1] محاورۂ حال میں سیر کو مؤنث بولتے ہیں ۱۲

در دُوار درپن بھئے، جب دیکھوں تب توہ،
کانکر، پاتھر، ٹھیکری - بھئے آرسی موہ،

از مؤلف

مُعافی اور اِنتقام

(۱) خطا سے پاک جُرم سے بَری عام آدمیوں میں تو کوئی نظر نہیں آتا - نہایت غنیمت ہیں وہ لوگ جن میں خوبیاں زیادہ اور بُرائیاں کم ہیں اور بہت ہی نیک ہیں وہ لوگ جو اوروں کی تاک میں نہیں رہتے - بلکہ اپنے ہی کاموں کو جانچتے ہیں - اُن میں جو خطا قصور پاتے ہیں - عین وقت پر اُن کا علاج کرتے ہیں -

(۲) اگر ہم اپنے تمام فعلوں کو انصاف کی نظر سے دیکھیں - تو معلوم ہو کہ ہم سے بہت سی خطائیں روزمرہ سرزد ہوتی ہیں - ہمارے اکثر کاموں سے دوسروں کو تکلیف پہونچتی ہے - لیکن ہم اپنے کرتوت کی جانچ میں

بہت غفلت کرتے ہیں۔ اِسی سبب سے نہ اپنی خطاؤں کو پہچانتے۔ نہ اُن کو بُرا جانتے ہیں۔

(۳) جب کہ ہم اپنے آپ کو بے قصور۔ بے خطا۔ بے جرم بے گناہ نہیں پاتے۔ تو نہایت نا انصافی کی بات ہے کہ اَوروں کی خطا کو سخت نگاہ سے دیکھیں۔ کیا وجہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو تو معذور سمجھیں۔ اور دوسروں کی ادنیٰ بھُول چوک کو بھی معاف نہ کریں۔ افسوس ہے کہ ہم اپنے قصوروں کو بالکل فراموش کر دیتے ہیں اِسی واسطے دوسروں سے خفیف قصور کا بھی بدلہ چاہتے ہیں۔

(۴) نیک آدمی سب کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرتے ہیں۔ لوگوں کی پوشیدہ خطاؤں کی ٹوہ میں نہیں رہتے ادنیٰ قصوروں پر گرفت نہیں کرتے۔ اپنے آپ کو ایسا بنا لیتے ہیں۔ گویا کہ اُنھوں نے کوئی قصور دیکھا ہی نہیں اِسی کو چشم پوشی کہتے ہیں۔ جو چشم پوشی کرتا ہے اُس کا رعب اوروں پر قائم رہتا ہے۔ جو شخص ذرا ذرا سی باتوں پر

بگڑنا اور خفا ہوتا ہے۔ وہ اپنا وقر اور بھرم کھوتا ہے۔

(۵) البتہ جو قصور تمھارے مقابلہ میں علانیہ اور قصدًا کیا گیا ہو۔ اُس پر ضرور باز پُرس کرو۔ اگر قصور وار اپنے قصور کا اقرار کرے۔ اور اپنے کام سے نادم ہوکر اپنی خطا کی مُعافی چاہے۔ تو فیاضی اور جواں مردی یہ ہے کہ فورًا مُعاف کردو۔ معافی سے تُم کو ایسی خوشی حاصل ہوگی جو اِنتقام لینے سے ہرگز نہیں ہو سکتی **مؤلّف**

نادموں کی خطا معاف کرو ہے معافی میں لذّت اورسُرور
اپنے دل میں ذرا کرو انصاف کون ہے جو ہے بےخطا و قصُور

(۶) بدلے کے قابل صرف وہ خطائیں ہوتی ہیں جن کا کرنے والا اِطّلاع پانے کے بعد بھی پشیمان نہ ہو۔ اور اپنی خطا کو خطا نہ جانے۔ بلکہ اُس پر اصرار کرے اِس صورت میں اِنتقام لینا واجب ہے۔ نہیں تو وہ قصور عادت بن جائے گا۔ خود قصور کرنے والے کو بلا میں پھنسائے گا اور دوسروں کو اذیّت پہونچائے گا۔ مؤلّف

جو انتقام نہ لینے سے ہو خطا افزوں
تو یہ تمھاری خطا ہے جو انتقام نہ لو
وہ کام جس سے کہ اوروں کو فائدہ پہونچے
تم اُس کے کرنے سے زنہار ہاتھ تھام نہ لو

(۷) نیک اور شریف آدمی اوّل تو کسی کے آزار کے روادار نہیں ہوتے۔ اور اگر نادانستہ کسی کے حق میں کوئی ادنیٰ خطا بھی اُن سے ہو جاتی ہے۔ تو اُن کو بہت افسوس اور بڑی ندامت ہوتی ہے۔ اور وُہ بے تامّل اپنی خطا کا اقرار کرتے اور بہت منّت سے اُس کی مُعافی چاہتے ہیں۔ کیونکہ خطا پر اصرار کرنا اور اُس کو بُرا نہ جاننا۔ یہ دوسری خطا ہے۔ خطا کرنے سے آدمی کے دِل میں اِس قدر بُرائی پیدا نہیں ہوتی جسقدر اپنی خطا کو خفیف سمجھنے سے پیدا ہوتی ہے۔ **مؤلف**

ہے بیمار تو لیک بچنے کے قابل — جو اپنی خطا کو خطا جانتا ہے
مگر ایسے نادان کا کیا ٹھکانا — کہ جو درد ہی کو دوا جانتا ہے

بُرا مانتا ہے جو سمجھائے کوئی بُرائی کو اپنی بھلا جانتا ہے
وہ انجام کو روئے کا سر پکڑ کر نہیں اِس میں دُھوکا۔ خُدا جانتا ہے

از شمس العلما مولانا شبلی نعمانی

سفر نامہ

پہلی مئی کی صُبح کو نُو بجے ہم جہاز پر سوار ہوے، تقریبًا بارہ بجے جہاز نے لنگر اُٹھایا، اور ہم نے ہندوستان کو "خُدا حافظ" کہا، سیکنڈ کلاس میں صِرف پانچ مسافر تھے، اور یہ عجیب اِتّفاق کہ سب کے سب مختلف قوم اور مختلف نسل سے۔ یعنی ایک مسلمان، ایک انگریز، ایک پارسی، ایک اسپینیر، ایک سیامی۔

جہاز کی حرکت اوّل اوّل تو چنداں ناگوار نہیں معلوم ہوئی، لیکن شام کے قریب طبیعت مُتغیّر ہونی شروع ہوئی، رات کا کھانا کھا کر سو رہے، صبح کو آنکھ کھُلی تو عجیب کیفیت تھی۔ دورانِ سر اور متلی کی ایسی سخت تکلیف تھی

جو کسی طرح بیان میں نہیں آسکتی۔ دو دن تک غشی کی سی حالت رہی جہاز کا ملازم کبھی کبھی چائے، بسکٹ نارنگیاں لاتا تھا کہ کچھ کھا لو، لیکن یہاں ان چیزوں کے دیکھنے سے اُبکائی آتی۔ مسٹر آرنلڈ چائے پی لیا کرتے تھے، اگرچہ ہضم نہیں ہوتی تھی، لیکن قے کرنے سے طبیعت ہلکی ہو جاتی تھی۔ اُن کے اِصرار سے میں نے بھی دو ایک بار چائے پی کر قے کی اور فائدہ محسوس ہُوا۔

تیسرے دن ہم سب اُٹھ بیٹھے۔ سُنا کرتے تھے کہ سمندر کی ہَوا تندرستی کے لئے نہایت مُفید ہے، درحقیقت جہاز کا سفر سَو علاجوں کا ایک علاج ہے، میں جہاز پر سوار ہونے کے وقت تک نہایت ضعیف اور مُضمحل تھا، لیکن روز بروز چاق و چُست ہوتا گیا۔ طبیعت کو ہر وقت نشاط رہتا تھا، اور بھُوک خوب لگتی تھی، ہم لوگوں کو پانچ وقت کھانا مِلتا تھا، یعنی صُبح کے آٹھ بجے چائے، دودھ، بسکٹ، گیارہ بجے معمولی کھانا، جن میں متعدد قسم کے سالن ہوتے تھے

ایک بجے ٹفن، پانچ بجے ڈنر، جس میں معمولی گوشت کے علاوہ مُرغ، بطخ، کبوتر، ہر قسم کی پڈنگ، تر اور خشک میوے ہوتے تھے، کبھی کبھی برف کی قُلفیاں بھی ہوتی تھیں رات کو نو بجے چائے اور مکھن، ہر وقت کا کھانا پیٹ بھر کر کھاتے تھے اور سب ہضم ہو جاتا تھا۔

۷ مئی ۱۸۹۲ء کو جہاز عدن پہونچا، اور کنارے سے کسی قدر فاصلہ پر لنگر انداز ہُوا۔ عدن میں بڑی دلچسپی یہ ہے کہ صُومالی قوم کے بہت سے لڑکے ڈونگیوں پر سوار جہاز کے قریب آتے ہیں، اور جہاز والوں سے انعام لینے کے لئے عجیب عجیب مُبتذل حرکتیں کرتے ہیں، کچھ ناچتے گاتے ہیں، کچھ آپس میں مل کر چند بے معنیٰ الفاظ کہتے ہیں، اور تالیاں بجاتے ہیں، بڑا کمال یہ ہے کہ لوگ دو آنی، چوانی، پیسے، جو کچھ اُن کو انعام دینا چاہتے ہیں، سمندر میں پھینک دیتے ہیں، وہ غوطہ مار کر نکال لاتے ہیں، اکثر انگریز اِس تماشے میں مصروف تھے، اور آئرلنڈ کو بھی

مزہ آتا تھا، لیکن میری کچھ اور حالت تھی، چونکہ غلطی سے میرا یہ خیال تھا کہ یہاں عموماً عرب آباد ہیں، اِس لئے طبعی بات تھی کہ میں اُن کو عزّت اور محبت کی نگاہ سے دیکھتا، لیکن وہ انعام لینے کے لئے ایسی بتذلل، ناموزوں اور حقیر حرکات کرتے تھے کہ کسی طرح طبیعت کو گوارا نہیں ہو سکتا تھا، عبرت ہوتی تھی کہ عرب کی اب یہ حالت ہے کہ غیروں کے سامنے اِس قسم کی حرکات سے اِن کو شرم نہیں آتی، شہر میں جا کر جب میں نے تحقیق کی اور تمام باتوں سے ثابت ہو گیا کہ مُکالی قوم عرب نہیں ہے تو مجکو کسی قدر تسکین ہوئی۔

عدن کی زبان عموماً عربی ہے، اور پارسی، ہندو بنگالی جو تجارت یا نوکری کے ذریعے سے یہاں رہتے ہیں، بے تکلف عربی بولتے ہیں۔ چونکہ میں نے کبھی کسی ہندو کی زبان سے اِس مُقدّس زبان کے الفاظ نہیں سُنے تھے، بنیوں اور بقالوں کو بولتے دیکھ کر عجب مزہ آتا تھا،

یہاں کی زبان گو عربی ہے، لیکن نہایت بیہودہ اور غیر فصیح ہے۔ اگرچہ آج کل تمام اُن ملکوں میں جہاں عربی بولی جاتی ہے، قدیم عربی نہیں رہی، لیکن عدن کی زبان سب سے نرالی ہے۔ دو چار معمولی الفاظ کے سوا مَیں کچھ نہیں سمجھ سکتا تھا۔ غالبًا یہاں کی زبان اجنبیوں کے اِختلاط کی وجہ سے خراب ہوتے ہوتے اِس حالت کو پہونچی ہے۔

عدن میں ایک جرمنی ہمارے جہاز پر سوار ہُوا جو جرمن کے مشہور عجائب خانہ کا ملازم ہے، اور مُدّت تک اِن اَطراف میں رہ کر یورپ کو واپس جارہا ہے۔ سیاحی وتجارت کی بدولت وہ متعدّد زبانوں میں بے تکلّف بات چیت کرسکتا ہے جب وہ جہاز کے افسروں سے اٹالین میں، آرنلڈ سے انگریزی میں، مجھ سے عربی میں گفتگو کرتا تھا۔ تو مجکو سخت تعجّب اور رشک ہوتا تھا۔ کھانے کی میز پر جب ہم سب جمع ہوتے تھے، تو یہی ایک شخص تھا

جو سب کا ترجمان بنتا تھا۔ اُس نے عرب و افریقہ کے جنگلوں سے بہت سے عجیب و غریب جانور ہم پہونچائے ہیں۔ ایک بڑے پنجرے میں افریقہ کے بندر تھے جن کی ہیئت معمولی بندروں سے کچھ الگ تھی، اِن میں زیادہ تر تعجّب انگیز بات یہ تھی کہ جب وہ کسی کو اپنی طرف آتے دیکھ کر غُل مچاتے تھے، تو اُن کی آواز سے بعض حروف مفہوم ہوتے تھے،

عدن سے چونکہ دل چسپی کے نئے سامان پیدا ہو گئے تھے، اِس لئے ہم بڑے لُطف سے سفر کر رہے تھے، لیکن دوسرے ہی دن ایک پُرخطر واقعہ پیش آیا، جس نے تھوڑی دیر تک مجکو سخت پریشان رکھا ۔ ۱۰ مئی کی صُبح کو میں سوتے سے اُٹھا۔ تو ایک ہم سفر نے کہا کہ جہاز کا انجن ٹوٹ گیا۔ میں نے دیکھا تو واقعی کپتان اور جہاز کے ملازم گھبرائے پھرتے تھے، اور اُس کی درستی کی تدبیریں کر رہے تھے۔ میں سخت گھبرایا اور نہایت ناگوار خیالات

دل میں آنے لگے۔ اِس اِضطراب میں اَور کیا کرسکتا تھا۔ دَوڑا ہُوا مسٹر آرنلڈ کے پاس گیا، وہ اُس وقت نہایت اطمینان کے ساتھ کتاب کا مُطالعہ کر رہے تھے، میں نے اُن سے کہا کہ "آپ کو کچھ خبر بھی ہے!" بولے "ہاں! انجن ٹوٹ گیا ہے" میں نے کہا کہ "آپ کو کچھ اضطراب نہیں! بھلا یہ کتاب دیکھنے کا کیا موقع ہے"! فرمایا کہ "جہاز کو اگر برباد ہی ہونا ہے، تو یہ تھوڑا سا وقت اَور بھی قدر کے قابل ہے اور ایسے قابلِ قدر وقت کو رائگاں کرنا بالکل بےعقلی ہے"۔ اُن کے اِستقلال و جرأت سے مجکو بھی اطمینان ہُوا آٹھ گھنٹے کے بعد انجن دُرُست ہُوا، اور بدستور چلنے لگا۔

۱۳ مئی کو جہاز سوئز پہونچا، اور تین چار گھنٹے کے لئے ٹھہرا، مصری عرب پنیر، کھجور، روٹیاں بیچنے کے لئے لائے اُن میں سے ایک نے مجکو ہندوستانی خیال کرکے اُردو میں باتیں کرنی شروع کیں، مجکو تعجّب ہوا۔ اور جب دریافت سے معلوم ہُوا کہ اُس نے کبھی ہندوستان

کی صورت نہیں دیکھی، تو اُردو کی عالم گیری پر مجکو اور بھی تعجّب ہُوا۔

۱۴۔مئی کو ہم پورٹ سعید پہونچے اور نہایت افسوس کے ساتھ مجکو مسٹر آرنلڈ سے جُدا ہونا پڑا بمبئی سے میں نے برنڈزی تک کا ٹکٹ لیا تھا، پورٹ سعید پہونچ کر یہ خیال ہُوا کہ برنڈزی تک تو آرنلڈ کا ساتھ ہے۔ لیکن وہاں سے قسطنطنیہ تک ایک ہفتے کا سفر ہے۔ اِتنی مُدّت تک محض اجنبیوں سے سابقہ۔ اور زبان اور مُلک کی اجنبیت کی وجہ سے ہر کام میں دِقّت ہوگی۔ اِس خیال کی بنا پر میں نے پہلی اسکیم بالکل بدل دی، اور ارادہ کر لیا کہ شام کے راستے سے قسطنطنیہ جاؤں گا۔

جہاز نے جس وقت لنگر کیا، کُک کمپنی کا ایک ملازم اپنے مسافروں کی خبرگیری کے لئے جہاز پر آیا، جہاز کنارے سے ذرا فاصلہ پر کھڑا ہوتا ہے۔ اِس لئے

مسافروں کی خبر گیری کے لئے کُک کمپنی کی طرف سے ایک چھوٹی سی کشتی ہمیشہ تیّار رہتی ہے، اِن بندر گاہوں میں جہاز سے اُترنے کے وقت نا تجربہ کار آدمی کو سخت مُصیبت پیش آتی ہے، جہاز کے لنگر کرنے کے ساتھ قُلی اور مَلّاح ہر طرف سے ٹوٹ پڑتے ہیں اور مسافروں کو سخت پریشان کرتے ہیں، اُن کے ہجُوم، شوُر وغل اور اسباب کی چھینا جھپٹی میں مُسافر بالکل بدحواس ہوجاتا ہے۔ ہزار دقّت کِنارہ پر پہونچا، تو گھنٹوں کرایہ کی بحث اور تکرار رہتی ہے۔ اِن بلاؤں سے محفوظ رہنے کا عُمدہ طریقہ یہ ہے کہ کُک کمپنی کے ملازموں کے سوا اور کسی سے کچھ واسطہ نہ رکھّے۔

پورٹ سعید ایک چھوٹا سا خوب صورت بندر گاہ ہے، آبادی کے دو حِصّے ہیں، جو حِصّہ دریا سے متّصل ہے، اُس میں عموماً یورپین سوداگر رہتے ہیں، اور بہت بڑے بڑے ہوٹل، قہوہ خانے اور تھیٹر وغیرہ ہیں + ایک

قہوہ خانہ عین دریا کے کنارے پر ہے، اور بہت ہی پُر فضا ہے، نہایت ترتیب کے ساتھ سنگ مرمر کے تختے کی چھوٹی چھوٹی میزیں اور اُن کے گرد کُرسیاں لگی ہوئی ہیں۔ قہوہ، چائے، توس، مکھن ہر وقت تیار رہتا ہے۔ اِس حصّہ میں کثرت سے دوکانیں ہیں، اور نہایت شان دار اور آراستہ ہیں۔ دوسرے حصّے میں زیادہ تر یہاں کے اصلی باشندے سکونت رکھتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ تمام چیزیں پست حالت میں ہیں۔ ہوٹل کے بجائے باورچیوں کی کثیف دُوکانیں ہیں۔

از شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالی

ہمدردی

ہمدردی کا لفظ "ہم" اور "درد" دو فارسی کلموں سے مُرکّب ہے: دَرد کے معنی دُکھ اور تکلیف کے ہیں اور ہم کا لفظ اِشتراک کے معنی دیتا ہے، پس، ہمدردی

کے لفظ سے دو یا کئی شخصوں کا دُکھ اور تکلیف میں شریک ہونا ظاہر ہوتا ہے؛ خواہ اِرادہ سے ہو، خواہ بے ارادہ مگر آج کل کے استعمال میں، ہمدردی سے وہ شراکت مُراد لی جاتی ہے جو ارادہ سے کی جائے: مثلاً ایک شخص بیمار ہے، اور دُوسرا رحم یا محبّت سے اُس کی دوا دارو کرتا ہے، تو دوسرے کو پہلے کا ہمدرد کہیں گے۔

ہمدردی پر جس قسم کی بحث فلاسوفی میں کی گئی ہے اُس کا ذکر کرنا، شاید، اِس موقع پر مُناسب نہ ہوگا۔ پس میں اُس کی ماہیّت بیان کرنے کی نسبت زیادہ تر اُس کے نتائج سے بحث کروں گا۔

اگر یہ بات سچ ہے کہ تمام اِنسان اصل میں ایک ہی درخت کی مختلف شاخیں اور ایک ہی دریا کے مختلف شُعبے ہیں، تو یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ تمام اِنسان ایک دوسرے کی ہمدردی کے ذِمّہ دار ہیں، اور ہر شخص مصیبت کی حالت میں اپنے ہم جنسوں سے مدد لینے کا

استحقاق رکھتا ہے۔ کون ہے جو اِس بات سے اِنکار کرے گا کہ بھائی کو بھائی سے ایک تعلّق ہے۔ جو ایک دوسرے کی ہمدردی پر مجبور کرتا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اِن بھائیوں کی اولاد میں اُس ہمدردی کا کوئی حِصّہ باقی نہ رہے۔ بیشک جب تک کہ باپ کے خون کا قطرہ اولاد کی رگ وپے میں باقی ہے ہمدردی کا رشتہ کبھی منقطع نہیں ہو سکتا۔

ہمدردی اَور حیوانات میں بھی پائی جاتی ہے بچّوں کو مدّت تک پرورش کرنا، اُن کے لئے غذا بہم پہونچانا تا بمقدور اُن کو دشمن کے حملہ سے بچانا، سب جانوروں کی عام خصلت ہے۔ اِس کے سوا، عام ہمدردی بھی اُن میں دیکھی گئی ہے۔ جنگلی بطخوں کا غول، جب کسی کھیت میں اُترتا ہے اور وہاں کسی طرح کا کھٹکا نہیں پاتا، تو سب کے سب ایک صف باندھ کر دانہ چُگتے ہیں۔ مگر اُن میں سے ایک ایک بطخ نوبت بہ نوبت اپنے ہم جنسوں کی جوکسی کرتی ہے۔ اور جب تک پہرہ دیتی

ہتی ہے۔ ایک دانہ نہیں کھاتی ٭ چیونٹا جب کہیں اناج کا ذخیرہ پاتا ہے، تو کبھی تن پروری نہیں کرتا، بلکہ اُسی وقت اپنے ہم جنسوں کو خبر کر دیتا ہے، اور تھوڑی سی دیر میں لاکھوں چیونٹوں کو وہاں جمع کر دیتا ہے، اِسی طرح اور مثالیں بھی پائی جاتی ہیں + اِس سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ ہمدردی انسان کی طبیعت میں ضرور رکھی گئی ہے، کیونکہ جو خوبیاں قدرت نے اور حیوانات کو عنایت کی ہیں، انسان اُن کا زیادہ تر مستحق ہے، دوسرے یہ کہ ہمدردی ایک قدرتی خاصیت ہے، جو بغیر تعلیم اور اکتساب کے انسان کی طبیعت میں خود بخود جوش مارتی ہے، اگر ایسا نہ ہوتا، تو اَور حیوانات میں، جو عقلی تعلیم سے بالکل محروم ہیں، اُس کا وجود ہرگز نہ پایا جاتا۔

ہمدردی انسان میں اِس لئے پیدا کی گئی ہے کہ کارخانۂ دُنیا کا اِنتظام، برہم نہ ہونے پائے، کیونکہ انسان

اپنی ضروریات میں ایک دوسرے کے محتاج ہیں، ایک کی گاڑی دوسرے کی مدد بغیر نہیں چل سکتی۔

سب سے زیادہ حقیر حلال خور کی قوم سمجھی گئی ہے مگر وہ بھی ایسی ضروری جماعت ہے، جس کے بغیر دُنیا کا کام نہیں چل سکتا پس اگر انسانوں میں ہمدردی نہ ہو تو یہ تمام کارخانہ درہم برہم ہو جائے۔

شاید یہاں یہ شبہہ پیدا ہو کہ "دُنیا میں جو کام اپنے ذاتی اغراض کے لئے کیے جاتے ہیں، وہ ہمدردی میں کیونکر داخل ہو سکتے ہیں: مثلاً کِسان زمین کے بونے جوتنے میں کوشش کرتا ہے، اور بیوپاری جو مال بھر کر سیکڑوں کوس لے جاتا ہے، اِس سے اگرچہ اَوروں کو بھی فائدہ پہونچتا ہے، مگر اُس کا اصل مقصود اپنا ذاتی فائدہ ہے پس اِس کو ہمدردی کیونکر کہہ سکتے ہیں"۔ اِس کا جواب یہ ہے کہ "جو خصلتیں اِنسان کو قُدرت نے تعلیم کی ہیں وہ کبھی اُس کے فائدہ سے خالی نہیں ہوتیں۔ پس

ہمدردی جو کہ آدمی کی قدرتی خاصیت ہے، اُس کے فائدہ سے خالی نہیں ہو سکتی، جو شخص کسی اپنے ہم جنس کو نفع پہونچاتا ہے، وہ حقیقت میں اپنی آسائش کے کسی وسیلہ کو تر و تازہ کرتا ہے، اور ایک یا چند واسطوں سے اپنی ذات کو فائدہ پہونچاتا ہے"۔ قدیم زمانہ میں تھیبا والے جو کہ دریائے ڈینوب اور ٹائبر کے درمیان بستے تھے جب اُن کے بڑے بوڑھے اپنے بال بچوں کو باہم ہنستے بولتے ایک دوسرے کے رنج و راحت میں شریک پاتے تھے، تو یہ کہا کرتے تھے کہ "نہایت عُمدہ ترکہ، جو ہم اپنی اولاد کے لئے چھوڑ جائیں گے، وہ یہی ہمدردی ہے جس کے آثار ہماری اولاد میں پائے جاتے ہیں"۔

ہمارے ہم وطن بھی ہمدردی کی اصل سے بے خبر نہیں ہیں۔ کنوئیں بنوانے، پیاؤ بٹھانی، سبیل لگانی محتاجوں کی خبر لینی، بیواؤں کی مدد کرنی، بیاہ شادیوں میں شریک ہو کر ایک دوسرے کے کام بنوانے، بیمار کی

عیادت، میت کی تعزیت، اور اسی طرح بہت سی باتیں ہمارے ملک میں بھی پائی جاتی ہیں ✦ بعض اوقات یہ قدرتی خصلت جس کا نام ہمدردی ہے، مشق اور تعلیم سے تمام قوم میں پھیل جاتی ہے، اور اُس کا اثر کسی قدر تیز ہو جاتا ہے ✦ لائی کرگس اور سولن، جو یونان کے دو بڑے مقنّن گذرے ہیں، اُنھوں نے اسپارٹا اور اے تھنز والوں کی ترقی کے لئے جہاں اَور بہت سی تجویزیں کی تھیں، اُنھیں میں سے ایک تجویز یہ بھی تھی کہ لوگوں کو طرح طرح سے ہمدردی کی ترغیب دی جائے۔ چنانچہ اِسی خیال سے لائی کرگس نے اوّل اسپارٹا میں تمام اراضی برابر حِصّوں پر تقسیم کر دی، تاکہ رعایا میں دولت و افلاس کا فرق باقی نہ رہے، اور ایسی صورت ہو جائے کہ جیسے ایک ماں جائے بھائی اپنے مورث کے ترکے میں برابر کے شریک ہوتے ہیں، پھر یہ قاعدہ جاری کیا گیا کہ لوگ گھروں میں کھانا چھوڑ دیں، بلکہ سب آپس میں مِل جُل کر

کھانا کھایا کریں، اور ہر شخص یہ خیال رکھے کہ ساتھیوں میں سے کوئی بھوکا تو نہیں رہا۔

سولن نے اپنے تھنز میں یہ قاعدہ جاری کیا تھا کہ جب کوئی شخص کسی کو تکلیف پہونچائے، تو دیکھنے والا مغلوب کی مدد کرے، اور غالب کو سزا دلوائے، تاکہ لوگوں کو ایک دوسرے کے رنج و راحت میں شریک ہونے کی عادت پڑے، اور ساری رعیت ایک خاندان کے آدمی معلوم ہوں۔ اس کے سوا یہ بھی حکم تھا کہ جو لوگ رفاہِ ملک کے جلسوں میں شریک نہ ہوں، اور اس بات کے منتظر رہیں کہ دیکھیں کیا ہوتا ہے، وہ جلا وطن کیے جائیں اور اُن کی جائداد ضبط کی جائے، ان تجویزوں سے لوگوں کے دلوں میں ہمدردی کا جوش بہت ہوگیا تھا اور ہر شخص یہ جانتا تھا کہ ہم سب ایک دوسرے کے رنج و راحت میں شریک ہیں ٭

ہم کو بھی ہماری گورنمنٹ، طرح طرح سے ہمدردی کی

تعلیم دے رہی ہے۔ قومی ہمدردی کا بڑا سرچشمہ سرشتۂ تعلیم ہے، کیونکہ اُس کے سبب سے بیشمار لڑکوں کو ایک معقول مُدّت تک باہم۔ میل جول رکھنا پڑتا ہے، اور رفتہ رفتہ اُن کے دِلوں میں ایک دوسرے کی محبّت کا بیج بویا جاتا ہے۔ پس ضرور ہے کہ جب وہ مدرسہ چھوڑ کر مُلکوں میں متفرّق ہوں تو اُن کا تعلّق اور رابطہ ہمیشہ برقرار رہے۔ اِس کے سوا گورنمنٹ کا یہ اُصول (کہ جو چندہ علم یا فن کی تعلیم کے لئے رعایا کی طرف سے فراہم ہو، اُس کی برابر گورنمنٹ کی جانب سے امداد کی جائے) ہم کو زبردستی اِس بات کی طرف کھینچتا ہے کہ تھوڑے بہت ہاتھ پانوں ہلا کر گرینٹ اِن ایڈ کا اِستحقاق حاصِل کریں، اور اپنے مُلک میں علم کی روشنی پھیلائیں ٭

مینونسپل کمیٹیاں جو سرکار نے جا بجا شہروں اور قصبوں میں قائم کی ہیں، اگر پُورا پُورا اپنا فرض ادا کیے جائیں

اور جس غرض کے لئے مقرر ہوئی ہیں، اُسی کو مدِّ نظر رکھیں تو یہ بھی ہمدردی کے اچھے نمونے ہیں +

علمی یا قومی سوسائٹیاں جن کی بُنیاد صرف انگلش گورنمنٹ کے پَرتو سے ہندوستان میں پڑی ہے - اگر اُن میں کچھ جان ہو اور فقط دھوکے کی ٹٹّیاں نہ ہوں، تو وہ سرچیون چشمے ہیں، جن سے تمام مُلک سیراب ہو سکتا ہے + زمانہ بھی طرح طرح سے ہم کو ہمدردی کی طرف مائل کر رہا ہے - ایک اعلیٰ درجہ کی شائستہ قوم جو ہماری خوش قسمتی سے ہم پر حکمران ہے، اُس کا چال چلن اُس کا اخلاق، اُس کا طریق معاشرت، اُس کے علوم و فنون، اُس کی دانشمندی، اُس کی تہذیب، اُس کے نئے نئے ایجادات، جو ہر وقت ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہیں، جب اِن باتوں کو اپنے مُلک کی موجودہ صورت کے ساتھ مقابلہ کریں، تو ضرور ہے کہ ہم کو اپنی اور اپنے ہم وطنوں کی نہایت وحشیانہ حالت پر افسوس آئے، اور

ہمدردی کا جوش ہمارے دلوں میں موج زن ہو ٭

مذہب بھی ہم کو بہت زور سے ہمدردی کی طرف کھینچتا ہے، ہندو، مسلمان، اگر اپنی مذہبی کتابیں دیکھیں گے تو اُن کو ہمدردی کی ترغیب سے مالا مال پائیں گے، یہ تمام تقریر جو اب تک کی گئی، اِس سے تین باتیں ثابت ہوئیں ایک یہ کہ قادرمطلق نے اپنے ہم جنسوں کی ہمدردی انسان کی سرشت میں پیدا کی ہے۔ دوسرے یہ کہ ہمدردی کا عمل درآمد قدیم سے کسی نہ کسی قدر ہمارے مُلک میں پایا جاتا ہے، تیسرے یہ کہ بہت سے اسباب ہمارے دائیں بائیں ایسے موجود ہیں، جو ہر وقت ہم کو ہمدردی کی تربیت دلاتے ہیں، پس ضرور ہے کہ ہمارے ہم وطنوں میں اعلےٰ درجہ کی ہمدردی پائی جائے، لیکن انصاف سے دیکھیے تو وہ بے سمجھ چیونٹا جو اپنی فتوحات سے ساری قوم کی پرورش کرتا ہے، اور وہ نادان بطّخ جو اپنے ساتھیوں کی نگہبانی میں گھڑیوں ایک ٹانگ سے

کھڑی رہتی ہے، ہم سے بہت زیادہ اِس فخر کے مستحق ہیں۔
ہمارے مُلک میں تین قسم کے آدمی ہیں، ایک دولتمند
دوسرے تعلیم یافتہ، تیسرے وہ جو نہ دولتمند نہ تعلیم یافتہ۔
پچھلے گروہ سے مُلک کو کوئی عام فائدہ نہیں پہونچ سکتا
مگر پہلے دونوں گروہوں کو مُلک کی ترقی اور بہبودی
میں اُسی قدر دخل ہے جیسے گورنمنٹ کو۔ بہت سے فائدے
ایسے ہیں جو مُلک کو بغیر اُن کی کوشش کے ہرگز نہیں
پہونچ سکتے، مگر ہمارے وطن کے یہ دونوں مُعزز گروہ
آج تک مُلک کے حقوق سے کچھ بھی سُبک دوش نہیں
ہوئے۔ دولتمند، اُن میں اکثر بے پروائی سے، اور بعضے
اِس خیال سے کہ ہماری کوشش سے تمام مُلک کی
حالت کیونکر بدل سکتی ہے، ہم وطنوں کی بھلائی کا
خیال نہیں کرتے، اور جو لوگ بے پروائی سے اِدھر
متوجّہ نہیں ہوتے، اُن سے ہم یہ پوچھتے ہیں؟ کہ اگر اُن کو
اپنے ہم وطن بھائیوں کی پروا نہیں ہے، تو کیا اِس بات کی بھی

پروا نہیں ہے کہ اُن کی دولت کی ترقّی ہو، اُن کی عزّت گورنمنٹ میں زیادہ ہو، اُن کی اولاد علم اور لیاقت حاصل کرے، اُن کے خاندان کی عزّت و آبرو ہمیشہ بنی رہے۔ اگر اُن کو یہ تمام خواہشیں ہیں، تو میں سچ کہتا ہوں کہ بغیر قومی ترقّی کے وہ ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک کہ تمام قوم کسی نہ کسی قدر عزّت کا استحقاق حاصل نہیں کرتی، اُس قوم کے چند آدمی اصلی عزّت کے مستحق نہیں ہو سکتے، جب تک تمام قوم میں علم کی روشنی نہیں پھیلتی، علم کا سلسلہ کسی خاندان میں قائم نہیں رہ سکتا۔ جب تک تمام قوم کے اخلاق دُرست نہیں ہوتے کوئی شخص خاندان کے اخلاق کی حفاظت نہیں کر سکتا۔ جب تک تمام قوم مُرفّہ الحال نہیں ہوتی، کوئی شخص دولت و حشمت سے اصلی خوشی حاصل نہیں کر سکتا ؛

ارشمس العلما ڈاکٹر مولوی نذیر احمد

زراعت وحرفت

ہندوستان اِس رو سے بڑا ہی خوش نصیب مُلک ہے کہ اُس میں پانی کی افراط ہے مٹّی قابل زراعت ہے موسم بھی مناسب ہیں، غرض ہندوستان میں غلّہ کثرت سے پیدا ہوتا ہے، اور اِسی سے یہ مُلک زرخیز اور سیر حاصل کہلاتا ہے. جس کو خُدا اِس مُلک کی سلطنت دے، مالگذاری کی وجہ سے اُس کا خزانہ ہمیشہ بھرپُور رہتا ہے. با ایں ہمہ کال کا بھی کھٹکا لگا رہتا ہے، کہ برسات نہیں ہوتی، تو زمینیں جوتی بوئی نہیں جاتیں، مگر اِتنا شُکر ہے کہ ہندوستان میں عالمگیر قحط نہیں ہوتا، اور متواتر کئی کئی برس کے لئے بھی نہیں ہوتا، اگر ایک حِصّہ میں ہوا، تو دوسرے حصّے اُس کو سنبھال لیتے ہیں، گرانی تو ہو جاتی ہے، مگر حاکم کی طرف سے اچھّا اِنتظام ہو، جیسا کہ

اب ہُوا کرتا ہے۔ تو لوگ بھوکوں مرنے نہیں پاتے۔
دُنیا کی ساری ضرورتوں میں سب سے بڑی ضرورت پیٹ بھرنے کی ہے، سچ کہتے ہیں کہ "نان نہیں تو جان نہیں" پس کاشتکاری کا پیشہ جو ایسی سخت ضرورت کو پورا کرتا ہے، بڑا سودمند، نافع خلائق اور معزز پیشہ ہونا چاہیئے۔
کاشتکاری میں بڑی خوبی اور عمدگی یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ کاشتکاروں کے ذریعے سے اپنے بندوں کو رزق پہونچاتا ہے، جس کے وہ سخت حاجتمند ہیں، اس سے بڑھ کر فضیلت اور کیا ہوسکتی ہے کہ بندوں کا ایک گروہ خاص خُدا کی شانِ رزاقی کے ظاہر ہونے کا ذریعہ ہو۔
مذہب اور اخلاق کی حیثیت سے دیکھا جائے تو دُنیا میں کوئی پیشہ کاشتکاری سے بڑھ کر پاکیزہ اور کسب حلال طیب نہ ہے، اور نہ ہو سکتا ہے، کہ اُس میں جھوٹ، دغا، فریب، مکر، کسی بدی کی ترغیب نہیں ۔ کاشتکار اگر ذرا احتیاط سے کام لے، تو اُس کی زندگی بڑے امن کے ساتھ گذر سکتی ہے،

اُس کو اپنے خُدا اور اپنے مویشیوں اور اپنے بال بچّوں کے سوائے ابنائے جنس میں سے کسی کے ساتھ تعلق رکھنے کی چنداں ضرورت نہیں. خدا اُس کو بے مِنّت غیرے سب سے بہتر روزی دیتا ہے، اُس کا پیشہ ہی ایسا ہے کہ اُس کو خُدا کی طرف سے غافل نہیں ہونے دیتا اور یہی وہ سچّی دینداری ہے جو کسی دُنیا دار کو نصیب نہیں ہوتی، اِلّا ماشا ءاللہ۔

تندرُستی کے اِعتبار سے مُفرّح ذات، مُمدّ حیات، مفاد کے اِعتبار سے کثیرُ المَنفعَت. غرض جس جس پہلو سے دیکھا جاتا ہے، کاشتکاری کے آگے کوئی کام خاطر تلے نہیں آتا. مگر نہایت افسوس کی بات ہے کہ جیسا یہ پیشہ فی نفسہ مُعزّز تھا، ویسا ہی لوگوں کے برتاؤ نے اِس کو ذلیل کر رکھا ہے۔ سبب کیا کہ قدیم الایّام سے راجہ یا بادشاہ جو کوئی بھی وقت کا حاکم ہوا، تمام زرعی زمین کا مالک مُنفرد تسلیم کر لیا گیا ہے۔ ایک ہندوستان میں نہیں بلکہ روے زمین پر

ہر جگہ حاکمِ وقت زمین کا مالک ہوا۔ تو بیچارے کاشتکار اُس کے مقابلے میں ایسے ہو گئے جیسے مالک مکان کے ہاتھ تلے کرایہ دار۔ یہی وہ دستور تھا، جس نے ہمیشہ کے لئے کاشتکاروں کا سارا زور توڑ دیا۔

اب حال یہ ہے کہ زمین جوتے کاشتکار، اپنی گرہ کا بیج بوئے کاشتکار، گاہے کاشتکار یعنی شروع سے آخر تک اپنا خون پسینا ایک کرے کاشتکار، خدا خدا کرکے اناج تیار ہوا، تو سرکار اپنا حصہ لینے کو موجود، اور حصہ بھی مَن مانتا حصہ، کیونکہ حاکم و محکوم کا ساجھا کیا۔ چھری خربوزے پر گرے، تو خربوزے کا نقصان، اور خربوزہ چھری پر گرے تو خربوزے کا نقصان، یوں تو کاشتکاری کی مٹی خوار ہوئی، انگریزوں نے پھر بھی کاشتکاروں کے ساتھ بہت سی رعایتیں ملحوظ رکھی ہیں. مگر آئے دِن اختیاری اضطراری ایسے بروگ آ پڑتے ہیں کہ کاشتکار پنپنے نہیں پاتے.

کاشتکاری ہی کی ایک شان ذرا اُس سے بہتر زمینداری ہے۔ بات یہ ہے کہ ملکیت ارضی کے دو پہلو ہیں، ایک پہلو تحصیل خراج کا ہے، اِس حق سے تو سرکار زمین کی مالک ہے، اور ایک پہلو زمین کے بیع و رہن کرنے کا ہے۔ یہ حق سرکار نے زمیندار کو دے رکھا ہے، یعنے زمین کی ملکیت میں دو شریک ہیں، سرکار اور زمیندار زمیندار کا کام ہے کہ فصل پر سرکاری خراج کاشتکاروں سے وصول کرے اور اپنا حقِ زمینداری جو کچھ بھی سرکار سے مُقرّر ہے، کاٹ کر باقی رقم سرکار میں پہونچائے۔ سرکاری خراج، جو زمیندار کاشتکار سے لیتا ہے۔ اُسی کو لگان کہتے ہیں۔ اور جو وہ اپنا حق رکھ لے کر تحصیلدار کے ذریعے سے سرکار میں پہونچاتا ہے، وہ مالگذاری ہے،

دوسرا ذریعۂ معاش دستکاری ہے کہ وہ کاشتکاری کو تو نہیں پاتا۔ مگر ہے اُس سے ملتا جلتا ہوا۔ کاشتکاری کی طرح دستکاری میں بھی آزادی ہے، یعنی تابعداری

نہیں. فرق اگر ہے تو اِسی قدر کہ کاشتکار زمین میں تصرّف کرتا ہے دستکار زمین میں نہیں، لکڑی، لوہا، کپاس، کوئی خاص چیز پکڑ لیتا ہے، اور اُس کو اپنی ہُنرمندی سے بکارآمد بناتا ہے۔ کاشتکاری میں محنت بہت. دستکاری میں کاشتکاری جیسی محنت نہیں، مگر سلیقہ بہت کاشتکاری میں جسمانی محنت، دستکاری میں دماغی۔ کاشتکاری میں ارضی و سماوی کتنی آفات کا خطر ہے، دستکاری اُن سے محفوظ۔ کاشتکاری میں خُدا کی قُدرت کو بڑا دخل ہے، دستکاری میں آدمی کی خُداداد لیاقت کو، مٹّی پتّھر، لوہا، لکڑی، سب چیزیں خُدا پیدا کرتا ہے، مِعمار، لوہار، بڑھئی اپنی اپنی دستکاریوں سے اِن چیزوں کو ترتیب دے کر عالی شان، خوشنما عمارت بنا کر کھڑی کرتے ہیں۔ مُلکی دولت اوّل درجے میں اناج، دوسرے درجے میں دستکاری، یہ دستکاری ہی تو ہے، جس کی بدولت یورپ کو آج سب طرح کے بھاگ لگ رہے ہیں۔ دُنیا کی دولت ہے

کہ دستکاری کے بدلے میں یورپ کو بھیجی چلی جاتی ہے۔ کتنی چیزیں ہیں کہ یورپ میں نہیں ہوتیں، خدا نے وہاں کی زمین میں ان چیزوں کے پیدا کرنے کی صلاحیت ہی نہیں دی، تو اہل یورپ دوسرے ملکوں کا پیداوار خام لے جا کر اپنے صرف میں لاتے یا اپنی ہنرمندی سے اس کو بنا سنوار کر دوسرے ملک والوں کے ہاتھ خاطر خواہ فائدے سے فروخت کرتے ہیں۔ مثلاً روئی کہ کپاس کی صورت میں اس کو لے گئے۔ کلوں کے ذریعے سے اوٹا، تو ما، کاتا، بُنا، اور طرح طرح کے خوشنما کپڑے تیار کر لیے۔ جن کو ساری دُنیا پہنتی ہے،

از شمس العلما ڈاکٹر مولوی نذیر احمد

شہنشاہی دربار

سنہ ۱۹۰۳ء کی صبح نوروز کا آغاز تھا کہ دہلی کے اطراف میں اس عظیم الشان جلسے کی آخری تیاریوں کی

چہل پہل شروع ہو گئی۔ جس کے شوق نے مہذّب دُنیا کے تمام اطراف سے ہزارہا آدمیوں کو کھینچ بُلایا تھا۔ والیانِ مُلک، رُوسا، گورنر و دیگر حکّام بالا اِس شاہانہ رسم کے واسطے اپنی اپنی خدمات کی تیّاریاں کرنے لگے، توپ خانے اور رجمنٹیں اپنے معہودہ مقامات کی طرف روانہ ہوگئیں۔ لیکن ملکی اور جنگی آدمیوں کے وہ جفاکش کارپرداز، جن کے سلیقۂ اِنتظام پر اِس جمِّ غفیر کی حُسن ترتیب کا مدار تھا، ابھی تک بڑی سرگرمی سے ابتری کے دفع کرنے اور اِنتظام میں مشغول تھے۔ اور بندوبست کر رہے تھے۔ کہ عین وقت پر کوئی حادثہ واقع نہ ہو۔ تماشائی اور سیلانی جیوڑے دہلی کی صُبح کی سردی کی تکالیف جھیل رہے تھے، تاکہ اِس تماشے کے موقع پر جس کا مُدّت سے اِنتظار تھا، عین وقت پر پہونچ جائیں تھوڑے ہی عرصہ بعد آب زدہ وسیع سڑکیں، جو دہلی سے ایمفی تھیٹر کی طرف (جو کہ کھُلے میدان میں کشمیری دروازے

سے چار میل شمال کی طرف واقع تھا) جاتی تھیں اور نیز دیگر راستے، جو مختلف کمپوؤں سے آتے تھے پیدل سوار اور گاڑیوں کے اِزدحام سے کھچا کھچ بھر گئے۔ اِس سارے انبوہ کا رُخ اُسی منزل مقصود کی طرف تھا۔ بعض لوگ لایٹ ٹرین میں بیٹھ بیٹھ کر جا رہے تھے، جن کا سٹیشن سے ایمفی تھیٹر تک ایک تانتا بندھا ہوا تھا، علی پور کی سڑک پر راجہ لوگ اپنی فوج اور رسالوں کے ساتھ زرنگار گاڑیوں میں بیٹھے چوکڑیاں اُڑائے چلے جاتے تھے۔ انگریزی ساخت کی لینڈو یا ٹمٹم سے لیکر لدھڑ بیلوں کے چھکڑے اور ہچکولے لگتے ہوئے یکوں تک ہر قسم کی سواریاں تماشائیوں کی بیشمار بھیڑ سے بھری ہوئی تھیں جن میں ہزار ہا مختلف صورتیں نظر آتی تھیں، کسی میں انگریزی اور دیسی عہدہ دار تھے، کسی میں اجنبی لوگ تھے، جو دریائے ہڈسن اور یارا کے کناروں یا پرٹیوریا اور ٹوکیو کے دار السلطنتوں سے آئے تھے، بعض جگہ

شمال مغربی سرحد کے پٹھان اور خود سر ملک یاغستان کے سردار نظر پڑتے تھے، اور بعض جگہ بلوچستان کی سطح مرتفع کے لمبی ڈاڑھیوں اور زلفوں والے جنگ جو اور چین اور تبت کے غیر مانوس زبان اور انوکھے لباس والے سرحدی دکھائی دیتے تھے، کہیں کہیں بحیرۂ عرب کے کنارے کے شیخ د سلطان بھی دیکھنے میں آتے تھے۔ الغرض سلطنتِ ہند کے متعلق ہر قسم کا آدمی موجود تھا۔

حسنِ اتفاق سے نوروز کے دن مسلمانوں کے مہینے شوال کی پہلی تھی، یہ وہ خوشی کا دن ہے۔ جس روز مسلمان اپنی عید مناتے ہیں۔ آج ماہ صیام ختم ہوتا ہے اس بزرگ مہینے میں تمام اہل اسلام ماہِ نو کی رویت تک سوائے سفر کی حالت کے طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک ہر قسم کے کھانے پینے کو حرام سمجھتے ہیں چاند رات کو ہر روزہ دار بکمالِ ذوق و شوق ہلال کی رویت کا

منتظر تھا، صبح کو یعنے دربار کے دن عیدگاہ میں نماز کا بڑا ہجوم ہُوا۔ گورنمنٹ نے اہل اِسلام کی سہولت اور آسائش کے واسطے جلسے کے اِفتتاح کا وقت دوپہر سے ساڑھے بارہ بجے کا کر دیا تھا، وقت سے کہیں پہلے اکثر تماشائی، عہدہ دار اور غیر عہدہ دار ایفی تھیٹر پر پہونچ گئے۔ سواریوں اور پیدل آدمیوں کے اِس عظیم ہنگامے میں پولیس نے جس خوبی سے اِنتظام اور بندوبست کیا، وہ بے شک قابلِ تحسین و آفریں ہے +

رؤسا کی سواریاں بیرونی احاطے کے دروازے تک پہونچتی تھیں، جہاں کہ ہر ایک کا اُس کے منصب کے مناسب اِستقبال ہوتا تھا۔ اور وہاں سے اُن کو ایک پولیٹکل افسر اُن کی خاص جگہ پر لے جاکر بٹھا دیتا تھا اِس توزک واحتشام کے ساتھ سو سے زیادہ رؤسا کا استقبال کرنا کوئی آسان بات نہیں تھی، لیکن اُن افسروں نے جن کو یہ خدمت تفویض ہوئی تھی، اِس

اہم کام کو اِس خوش اُسلوبی سے سرانجام دیا کہ کوئی غلطی اور شکایت نہ ہوئی۔ ہر رئیس کو آتے کے ساتھ وائسراے کی اُس تقریر کا جو کہ وہ دربار کے موقع پر پڑھنے کو تھے، ایک اُردو ترجمہ پیش کیا جاتا تھا۔ یہ صلی پر سُنہرے حرفوں میں چھپا ہوا تھا، علاوہ ازیں اور معزز آدمیوں اور درباریوں کو بھی ایسے ہی ترجمے تقسیم کیے گئے، لیکن وہ بجاے سُنہرے حرفوں کے سُرخ حرفوں میں چھپے ہوئے تھے، الغرض حُضّارِ جلسہ میں سے اور خصوصًا تعلیم یافتہ اور ذی رتبہ لوگوں میں سے شاید ہی کوئی ایسا متنفّس ہوگا، جو جلسے کی کارروائی کو باوجود انگریزی زبان کی ناواقفیت کے اچھی طرح نہ سمجھ سکا ہو۔

(از تاریخ دربار تاج پوشی)

شمس العلما مولوی نذیر احمد۔ ایل ایل۔ ڈی (اڈنبرا)

شرافت پر مکالمہ

الف۔ میرے نزدیک، شرافت، یعنی شرافتِ نسب

کوئی چیز نہیں۔ ہمارے پاس عقلی شہادت موجود ہے، کہ کل آدمی ایک آدم کی اولاد ہیں، اُن کی جسمانی بناوٹ اُن کی خواہشیں۔ اُن کی ضرورتیں سب یکساں ہیں، کسی کو کسی پر ترجیح نہیں، یہی وہ خیال ہے جو میرے نزدیک سب سے زیادہ ہم مسلمانوں کے تنزل کا باعث ہوا جو لوگ شریف گنے جاتے ہیں۔ وہ شرافت کی شیخی میں آکر کسی طرح کا کمال حاصل کرنا نہیں چاہتے، اور جو لوگ رذیل سمجھے جاتے ہیں اُن کو لیاقت کے پیدا کرنے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔

د۔ نہیں! نہیں! شریف و رذیل کیسے برابر ہو جائیں گے، کہنے کو تو آدمی وہ بھی، آدمی یہ بھی، مگر آدمی آدمی انتر کوئی ہیرا کوئی کنکر۔ اوّل تو صورت سے شریف و رذیل الگ پہچان پڑتے، شریفوں کو دیکھو گے اکثر رنگ کے گورے، چہرے مُہرے کے درست، صورت شکل کے پاکیزہ، متناسب الاعضا۔ نازک کہ دیکھے سے ہی خوش ہوتا ہے،

اور رذیل ہیں کہ اُن کی صورتیں ہی کچھ دوسری طرح کی ہوتی ہیں، پکّی پکّی، بھنگم، کرخت، بدرنگ۔ اور چونکہ یہ فرق پیدائشی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ خُدا کی مرضی سے ہے۔ جیسے گھوڑا اور گدھا کہ خُدا نے دونوں کو یکساں نہیں بنانا چاہا، اور نہ وہ یکساں ہیں، اور نہ کوئی اُن کو یکساں سمجھ سکتا ہے۔

الف۔ یہ قیاس مع الفارق ہے، اگر رذیلوں کی یعنے اُن لوگوں کی جن کو تُم رذیل کہتے ہو صورتیں اچھّی نہیں، تو اُس کی وجہ ہے کہ اُن کو معاش پیدا کرنے کے لئے محنتیں کرنی پڑتی ہیں۔ وہ گرمی کے دنوں میں میر مہین اور مرزا پُھویا بن کر تہ خانوں میں رہ نہیں سکتے، نہ دُھوپ اور مینھ اور سردی سے بچنے کے لئے اُن کے پاس سامان ہے کہ اُن کا رنگ میلا نہ ہو، اور نہ وہ بیکار رہ سکتے ہیں کہ اُن کے اعضا نرم اور پلپلے ہوں، اُن کی یہ حالت داغ خود غرضی ہے اِنسان کے ناصیۂ حال پر جو کسی طرح دُھل نہیں سکتا۔ کیا حق رکھتا ہے، ایک شخص، اِتنا کھا جانے کا

کہ اُس کے ہضم کرنے کے لئے اُس کو چورن کی ضرورت ہو؟
جب کہ اُسی جیسے ہزاروں بندگانِ خُدا مارے بھوک کے
انتڑیوں کو مسوس کر رہ جاتے ہیں۔ کیا حق رکھتا ہے
ایک شخص، قیمتی دوشالہ اُوڑھنے کا؟ جب کہ دوسرے
آدمی کو کمبل بھی نصیب نہیں۔ کیا حق رکھتا ہے
ایک شخص، خُدا کی دی ہوئی دولت کو شیخی اور نام ونمود
میں لُٹانے کا؟ جب کہ بہتیرے ایک مُٹھی چنوں کے
لئے کوڑی دوکان مانگتے پھرتے ہیں اور نہیں ملتی،
دُنیا میں جس قدر مُصیبت ہے، صرف اِس وجہ سے ہے
کہ ہم میں سے جتنے آرام پر جس کا قابو چلا دبا بیٹھا۔ چٹکی
کی جگہ مُٹھی، مُٹھی کی جگہ لپ، لپ کی جگہ جھولی، جھولی کی
جگہ گٹھری، ڈھیری، ڈھیر، پہاڑ۔ مجھکو تو ہنسی اِس بات پر
آتی ہے کہ کرتوت تو یہ ہے اور اُس پر بعض کو دعوے
ہیں ہمدردی کے، رحم کے، جود وسخا کے، بذل و ایثار
کے، غرض ہیں حضرتِ انسان بھی عجائب المخلوقات،

کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔ کرنا چاہیئے کیا اور کر رہے ہیں کیا!

د۔ لیکن شریف و رذیل کی عادت اور طبیعت کا فرق بھی تو دیکھیے، انتظامِ دُنیا اِسی طرح واقع ہوا ہے کہ سب لوگ ایک حالت کے نہ ہوں، ایک محتاج ہو، دوسرا محتاج الیہ! ایک آمر ہو دوسرا مامور، ایک خادم ہو، دوسرا مخدوم، اور اگر سب کی ایک ہی حالت ہوتی تو دُنیا کا انتظام دگرگوں ہوتا۔ آپ اگر سب کو ایک حالت کا بنانا چاہتے ہیں۔ تو اِس کے یہ معنیٰ ہیں کہ آپ انتظامِ الٰہی میں دخل دیتے ہیں آج تو آدمی ہے، کل کو آپ جانوروں کی وکالت کریں گے کہ یہ بھی جان رکھتے ہیں، اِن کو بھی آرام و تکلیف کا اِحساس ہے، آدمی کیوں اِن پر سوار ہو، کس لئے اِن پر بوجھ لادے، اِن سے محنت و مشقت کے کام لے، اور سب سے بڑھ کر کیوں کس واسطے اپنے مزے کے لئے اِن کو جان سے مارے؟ پھر آپ اور ترقی کریں گے تو درختوں کا ترس کھائیں گے

کہ اِن کی بھی ایک طرح کی زندگی ہے، لکڑی نہ کاٹو، پتّا نہ توڑو، ایندھن نہ جلاؤ، خلاصہ یہ کہ دوسروں کی خاطر مَر رہو *

ص۔ میرے دونوں دوست **الف** اور **د** مجکو معاف فرمائیں گے، اگر مَیں یہ کہوں کہ دونوں صاحب اصل مطلب سے الگ ہو کر، افراط و تفریط کے کناروں پر آ گئے ہیں۔ ہم کو صِرف یہ دیکھنا ہے کہ شرافتِ نسب کوئی چیز ہے بھی یا نہیں۔ میں کہتا ہوں اور دُنیا کی تمام قومیں اِس کو تسلیم کرتی ہیں کہ بے شک زمانے میں ایسے باکمال لوگ ہوتے آئے ہیں، جو ایک صفت یا چند صفتوں میں اپنے ابنائے جنس پر تفوّق رکھتے تھے۔ اور جس کو خُدا ممتاز کرتا ہے۔ اُس کی نسبت سے اُس کی سب چیزوں میں وقعت آ جاتی ہے، یہاں تک کہ رہنے کے مکان میں، پہننے کے کپڑوں میں، باندھنے کے ہتھیاروں میں سواری کے جانوروں میں۔ لارڈ ٹینس مشہور انگریزی

ملک الشعرا حال میں مرا ہے، اُس کے بیٹھنے کی کرسی کے، لکھنے کی میز کے، قلم کے، دوات کے لوگ لاکھوں روپیہ دینے کو موجود ہیں، اُس کے وارث چونکہ خود مقدور والے ہیں، نہیں دیتے * اور اس طرح کی مثالیں ڈھونڈھنی چاہو تو ہر ایک مُلک اور ہر ایک قوم میں کثرت سے ملیں گی کہ نامور لوگوں کی نسبت سے اُن کی سب چیزوں میں وقعت آجاتی ہے، تو کیوں اُن کی نسلوں کی وقعت نہ ہو، جو اُن کی زندہ یادگار ہیں اور اُن کے ساتھ نسبت بھی قوی اور قریب کی رکھتے ہیں۔ یہ ہے مآخذ شرافتِ نسب کی قدر کا۔ اب دوسری بات میں یہ کہنی چاہتا ہوں کہ آدمی اشرف المخلوقات تو ہے۔ مگر اپنی مجموعی حالت کے، اعتبار سے، ورنہ اُسی کی بہت سی باتیں حیوانوں سے ملتی ہیں کہ اُن ہی کی طرح وہ کھاتا، پیتا، سوتا، چلتا، پھرتا ہے، اُس میں کئی خواص نباتات کے ہیں کہ اُس کو بالیدگی ہے، پھولنے پھلنے کے عوض اُس کی نسل چلتی ہے۔ درختوں میں

ہم دیکھتے ہیں کہ ہر ایک درخت کے مزاج شخصی کے مطابق
اُس میں پھل لگتا ہے، ہو نہیں سکتا کہ نیم کے درخت میں
نیبو پھلیں۔ یا نیبو کے درخت میں نیبولیاں، جس درخت کے
پھل میں ایک خاص ذائقہ ہے اُس سے قیمتی نسل
چلے گی۔ وہ ذائقہ کم و بیش سب پھلوں میں ہوگا
غرض یہ بات، نباتات، حیوانات اور انسان سب میں
یکساں طور پر پائی جاتی ہے کہ نسلیں اپنی بزرگوں کے ساتھ
مشابہت اور مماثلت کو باقی رکھتی چلی آتی ہیں۔ اِس کی
تصدیق اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِاَبِیْہِ سے ہوتی ہے اور اِسی طرح کی
ایک کہاوت ہندی میں بھی ہے "باپ پر پوت
پتا پر گھوڑا بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا" یہ مشابہت
نہ صرف جسمانی بناوٹ میں ہوتی ہے بلکہ اُفتاد مزاج
میں بھی۔ میرے متعارفین میں ایک صاحب ہیں اُن کی
گدی میں ایک مَسّا ہے، وہ اُس کو مُہرِ شرافت
کہا کرتے ہیں۔ اُن کا بیان ہے کہ "ایسا ہی مسّا اِسی جگہ

میرے باپ اور دادا کی گردن میں تھا، میرے ہوا بیٹا تو اُس کی گردن میں بھی ایک مضمحل سا نشان مسّے کا تھا لیکن گدّی میں نہیں بڑے ہو کر وہ مسّا کھسکتے کھسکتے اُسی خاندانی جگہ آ رہا"۔ ایک نوجوان آدمی کا حال مجکو معلوم ہے کہ وہ شروع سے نہ باپ پاس رہا، نہ اُس سے پڑھا، لیکن باپ بیٹوں کا سوادِ خط اِس قدر اشبہ ہے کہ تمیز نہیں ہو سکتی۔ ہم خیال نہیں کرتے، ورنہ اِس مشابہت کی مثالیں اس کثرت سے موجود ہیں کہ ہر فرد بشر، ہر جانور ہر پھل، ہر پھول، ہر پتّا، اُس کی گواہی دے رہا ہے، بس شرافتِ نسب کی قدر کرنے کے یہ معنے ہیں کہ ہم حقیقت میں اُن صفتوں کی قدر کرتے ہیں، جو بانیِ سلسلۂ نسب میں تھیں، اور اُن صفتوں کے قابلِ قدر ہونے میں کسی کو گنجائش گفتگو نہیں، تو قدرِ نسب میں کیوں ہو؟

لیکن ہاں! یہ بات بھی خیال کرنے کی ہے کہ تعلیم سے، تربیت سے، دوسروں کے پاس اُٹھنے بیٹھنے، رہنے سہنے سے بھی

آدمی کے مزاج پر، اخلاق پر، عادت پر، بڑا اثر پڑتا ہے، اور اچھوں کی اولاد بُری اور بُروں کی اچھی ہو جاتی ہے، اور یہی حال نباتات کی پود اور حیوانات کی نسل کا ہے، پھر بھی اصالت اپنا رنگ دکھائے بدون نہیں رہتی، اصل سے خطا نہیں اور کم اصل سے وفا نہیں،

از مولوی سجّاد مرزا بیگ دہلوی (علیگ)

اطاعت

سب سے زیادہ ضروری سبق جو طفولیّت میں حاصل کرنا چاہیئے "اطاعت" ہے، اور اس کے یہ معنے ہیں کہ جب ہم سے زیادہ لائق اور قابل رائے ہم کو راستہ بتائے تو ہم اپنی رائے کو چھوڑ دیں۔ اور اُس کی پیروی کریں۔ اطاعت کا یہ مادّہ سوسائٹی میں متّحدہ طور پر کام کرنے کی بُنیاد ہے۔

عموماً جو قواعد مقرر کیے جاتے ہیں، وہ عوام کی بھلائی

اور بہبود کے لئے ہوتے ہیں، اور اگرچہ کسی خاص شخص کی شرکت قواعد اور قانون بنانے میں نہ ہو، الاّ مدنی حالت میں امن جب ہی رہے گا، جب ہر شخص اپنے فرماں روا، اپنے حاکم، اپنے بڑے کا کہا مانے + آزادی صرف اِس قدر جائز ہے، جہاں تک کسی شخص کی ذاتیات سے تعلق ہے۔ لیکن اگر تمدن میں آرام مطلوب ہے۔ اور سوسائٹی میں سکون اور باقاعدگی درکار ہے، تو کوئی شخص اُن بندشوں سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ جو اُس کو اتحاد اور وحدانیت کے رشتہ میں جکڑتی ہیں، اور جو شخص سوسائٹی میں زیادہ ممتاز ہے۔ وہی زیادہ پابند اور مطیع ہے، کیونکہ وفادارانہ اطاعت اُس کے لئے نہ صرف فرض ہے۔ بلکہ اُس کی محافظ بھی ہے ؎

حکومت کرنے کو دل تو سب کا چاہتا ہے، مگر جو لوگ اطاعت کے خوگر نہیں ہوتے، وہ عُمدہ حاکم بھی نہیں بنتے، اور جو ٹھیک ٹھیک اطاعت کرنا جانتے ہیں، وہ ٹھیک ٹھیک

حکومت بھی کرسکتے ہیں۔ کیونکہ غیر مطیع شخص یہ نہیں جانتا کہ حکومت کی حد کیا ہے۔

اِطاعت میں سب سے اول حق والدین اور قریبی رشتہ داروں کا ہے۔ اور اِسی سبب سے گھر اطاعت سکھانے کا پہلا مدرسہ ہے۔ والدین خواہ بلحاظِ مرتبت اور خواہ بلحاظ عُمر و تجربہ اولاد پر بزرگی رکھتے ہیں۔ لہٰذا اولاد کو اُن کی اطاعت لازم ہے، اور والدین کا فرض ہے کہ صرف اُن کو پرورش ہی نہ کریں، بلکہ ملکۂ اطاعت اولاد میں پیدا کریں، تاکہ وہ آیندہ سوسائٹی کے بکار آمد ممبر اور ملک و قوم کے لئے بہترین نعمت ہوں۔

اگر اولاد اپنے بزرگوں کا کہا نہ مانے۔ اُن کی شُکرگذار نہ ہو، اگر یہ نہ جانے کہ والدین کی اطاعت ہماری سعادت اور بہبودی کا باعث ہے تو اُس گھر میں خوشی اور امن و آسائش کی اُمید نہ رکھنی چاہیئے، نہ اُن لوگوں سے آیندہ زندگی میں سوسائٹی کا عُمدہ اور امن جو ممبر ہونے کی

توقع ہوسکتی ہے۔ جو شخص محبت اقربا کے نرم رشتوں کا پابند نہ ہو اور اُن کی موافقت نہ کرے، تو حقوقِ تمدّن کی سخت پابندیاں کب برداشت کرسکے گا، نہ وہ اچھا کارکن ہوگا۔ نہ اچھا کار فرما، گھر کے بعد مدرسہ اطاعت آموز ہوتا ہے، مُعلّم وہ بزرگ ہیں کہ والدین نے اولاد کو اپنی تعلیم و تربیت سے نکال کر اُن پر بھروسہ کیا ہے۔ پس معلّموں کا فرض اطاعت سکھانا اور شاگردوں کا کام اطاعت کرنا ہے، کیونکہ اُستاد جو کچھ کرتے ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں، وہ صرف طلبا کی بہبودی اور بھلائی کے مقصد سے ہوتا ہے اور بغیر تربیت اور تنبیہ کے کوئی عمدہ عادت نہیں پیدا ہوتی،

آج کل آزادی کا بہت چرچا ہے۔ اور اِس میں شک نہیں کہ انسان کے لئے آزادی بہت عُمدہ چیز ہے۔ لیکن جب ہی تک عُمدہ ہے کہ آزادی آزادی کی حد تک رہے یعنے یہ کہ ہر انسان کو اپنے ایسے ذاتی

کاموں میں۔جن کا اثر دوسروں پر نہ پڑتا ہو، اختیار حاصل ہے کہ جو چاہے سو کرے۔لیکن سوسائٹی میں رہ کر وہ اُن قواعد اور بندشوں سے آزاد نہیں ہو سکتا جو تمام لوگوں کے امن و آسائش قائم رکھنے کے لیے مقرر و مسلّم ہیں ٭

از مولوی سیّد وحید الدّین سلیم

قرض

(۱) اگر تم چاہتے ہو کہ دولت مند بنو تو جس طرح تمھاری توجّہ دولت جمع کرنے پر مائل ہے۔اسی طرح کفایت شعاری پر اپنی توجّہ مبذول کرو ٭

(۲) سب آدمی دولت جمع کرنے کی قابلیّت رکھتے ہیں۔مگر جو آدمی دانشمند اور عاقبت اندیش ہیں وہ اِس بات کی قابلیّت رکھتے ہیں کہ اوّل دولت جمع کریں پھر اُس کو محفوظ رکھیں۔بعض لوگ اَوروں کو نصیحت

کرتے ہیں۔ مگر خود اُس پر عمل نہیں کرتے ۔

(۳) ایک حکیم کا قول تھا کہ کام کرنا اور محنت میں سرگرم رہنا بیشک عُمدہ ہے۔ مگر کام اور محنت سے بھی عُمدہ یہ ہے کہ کفایت شعاری کا خیال ہر دم پیش نظر رہے۔

(۴) جو آدمی دولت کمانی جانتا ہے۔ مگر یہ نہیں جانتا کہ اُس کو کیونکر محفوظ رکھے وہ زندگی بھر تھکا دینے والی محنت میں مشغول رہتا ہے۔ اور مرتے وقت کچھ باقی نہیں چھوڑتا + خوش نصیب اور تونگر وہ آدمی نہیں ہے۔ جو دولت جمع کر لیتا ہے۔ بلکہ خوش نصیب اور تونگر وہ آدمی ہے۔ جو دُنیا میں دولت کما کر چھوڑ جاتا ہے + خدا نے عادت میں یہ طاقت رکھی ہے کہ انسان ہر قسم کے کام اُس کی مدد سے بغیر کسی تکلیف اور مشقت کے انجام دے سکتا ہے +

(۵) جس طرح ہر ایک انسان آسانی سے فضول خرچی کی عادت ڈال لیتا ہے۔ اِسی طرح اگر وہ چاہے۔ تو

کفایت شعاری کا عادی بن سکتا ہے ✣

(۶) ایک حکیم کے اقوال کفایت شعاری کے متعلق ایسے مُفید اور کارآمد ہیں کہ اُن پر ہر شخص کو غور کی نظر ڈالنی چاہیئے۔ ہم اُن میں سے بعض اقوال اِس مقام پر درج کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے " اگر تُم دولت کی قدر و قیمت معلوم کرنی چاہتے ہو۔ تو اُس کی آسان ترکیب یہ ہے کہ تم کسی سے قرض لو۔ اِس تجربہ سے تم یہ بات جان جاؤگے کہ جو شخص لیتا ہے۔ وہ لوگوں کی نظروں میں ذلیل ہو جاتا ہے۔ اگر تم اپنے سوا اور کے مقروض ہو تو یقین کرو کہ تُم اُس کے غلام ہو۔ ہر ایک روپیہ جو تُم اپنے ہمسایہ سے قرض لیتے ہو وہ تمھاری ذاتی شرافت اور آزادی کی قیمت ہے جس کے عوض میں تم نے اِس شرافت اور آزادی کو دوسرے کے ہاتھ گرو کر دیا ہے۔ اِفلاس انسان کی دلیری اور آزادی کو ملیا میٹ کر دیتا ہے۔ غور کرو کہ خالی تھیلی جس میں روپیہ نہیں ہے۔ فرش پر سیدھی

کھڑی نہیں ہو سکتی ۔

(۷) اگر تم جانتے ہو کہ جو شخص کسی سے قرض لیتا ہے وہ اُس قرض دینے والے کا غلام ہو جاتا ہے۔ تو میں تم کو نصیحت کرتا ہوں کہ اِس لعنت کے طوق سے اپنی گردن بچاؤ اور اپنی آزادی پر داغ نہ آنے دو اور دُنیا کا ہر ایک ادنیٰ سے ادنیٰ کام جو تم سے ہو سکے اختیار کر لو۔ پھر کفایت شعاری کا خیال رکھو۔ اِس سے تمھاری آزادی برقرار رہے گی۔ اور تم کسی کے غلام نہیں بنو گے۔

(۸) اگر تم اپنا خرچ اپنی آمدنی سے کم رکھ سکتے ہو۔ تو سمجھ لو کہ پارس کا پتھر تم نے حاصل کر لیا۔ عرب کی مشہور مثل ہے کہ "قرض محبت کی قینچی ہے" اِس کے سچ ہونے میں کیا شک ہے۔ میرے عزیز نوجوانو! اگر تم چاہتے ہو کہ دُنیا کے لوگ تم سے محبّت کریں اور تم اُن سے محبّت کرو۔ تو خبردار اِس قینچی کو ہاتھ میں نہ لینا۔ کیونکہ اِس سے محبّت کا رشتہ بہت آسانی سے کٹ جاتا ہے" ۔

(۹) چین کی کہاوت ہے کہ "قرض عزّت کی دِرانتی ہے" اِس کے سچ ہونے میں ذرا شبہہ نہیں۔ میرے عزیزو! اگر تم چاہتے ہو کہ دُنیا کے آدمی تم کو عزّت کی نظر سے دیکھیں۔ اور تم اُن کے ساتھ عزّت سے پیش آؤ۔ تو بھولے سے بھی اِس دِرانتی کو نہ پکڑنا۔ کیونکہ اِس سے عزّت کی کھیتی کٹ کر ڈھیر ہو جاتی ہے ٭

از شمس العلما مولوی محمّد حسین آزاد

اہلِ فرنگ عہدِ اکبر میں

اکبر اگرچہ علوم و فنون کی کتابیں نہ پڑھتا تھا۔ مگر اہلِ علم سے زیادہ علوم و فنون اور شائستگی اور تہذیب کا عاشق تھا۔ اور ہمیشہ ایجاد و اختراع کے رستے ڈھونڈھتا تھا اُس کی دلی آرزو یہ تھی کہ "جس طرح فتوحات مُلکی اور شجاعت و سخاوت میں نامور ہوں" اور "میرا مُلک قدرتی پیداوار اور زرخیزی میں باغ زرریز ہے۔ اِسی طرح علوم و فنون

ہیں نامور ہو۔ وہ یہ بھی جان گیا تھا کہ علم و کمال کے آفتاب نے یورپ میں صُبح کی ہے، اِس لئے اُس مُلک کے باکمالوں کی تلاش رکھتا تھا۔

یہ امر قانونِ قدرت میں داخل ہے کہ جو ڈھونڈھے گا سو پائے گا۔ سامان اُس کے خود بخود ہوجاتے ہیں۔ اُن میں سے چند اتّفاق لکھتا ہوں :۔

سنہ ۹۷۹ ہجری میں ابراہیم حسین مرزا نے بغاوت کرکے قلعۂ بندرسورت پر قبضہ کرلیا۔ بادشاہی لشکر نے جاکر گھیرا۔ اور خود اکبر بھی یلغار کرکے پہونچا۔ سوداگرانِ فرنگ کے جہاز اُن دنوں میں آتے جاتے رہتے تھے۔ مرزا نے اُنھیں لکھا کہ اگر تم آؤ اور اِس وقت میں میری مدد کرو۔ تو قلعہ تمھیں دے دوں گا، وہ لوگ آئے۔ مگر بڑی حکمت سے آئے یعنی بہت سے عجائب و غرائب تحفے مختلف مُمالک کے ساتھ لیتے آئے جب لڑائی کے پلّے پر پہونچے۔ تو دیکھا کہ سامنے کا وزن بھاری ہے۔ مقابلہ میں کامیاب

نہ ہوسکیں گے۔ جھٹ رنگ بدل کر ایلچی بن گئے۔ اور کہا کہ ہم تو اپنی سلطنت کی سفارت پر آئے ہیں۔ دربار میں پہونچکر تحفے تحائف گذرانے، اور خلعت و انعام کے ساتھ مُراسلہ کا جواب لے کر رخصت ہوئے ٭

اکبر کی ایجاد پسند طبیعت اپنے کام سے کبھی نچلی نہ رہتی تھی۔ جس طرح اب بمبئی اور کلکتہ ہے۔ اُن دِنوں اکثر ممالک یورپ اور ایشیا کے جہازوں کے لئے گودہ اور سورت بندرگاہ تھے، معرکہ مذکور کے کئی برس بعد اُس نے حاجی حبیب اللہ کاشی کو زر کثیر دے کر روانہ کیا۔ صنعتوں کے ماہر اور ہر فن کے مبصّر ساتھ کیے کہ بندرگاہ گودہ میں جاکر مقام کرو اور وہاں سے عجائب و نفائس دیار فرنگ کے لاؤ، اور جو صنعت گر اور دستکار ممالک مذکورہ کے وہاں سے آسکیں۔ انھیں بھی ساتھ لاؤ ٭

وہ ۹۸۴ھ میں وہاں سے پھرے، تحائف و عجائب کے علاوہ جماعت کثیر اہل کمال کی ساتھ لائے جس وقت شہر میں داخل ہوئے

تو عجائبات کی برات بن گئی۔ انبوہ کثیر جوان و پیر کا ساتھ تھا۔ بیچ میں بہت سے اہلِ فرنگ اپنا مُلکی لباس پہنے اور اپنے قانون موسیقی کے بموجب فرنگی باجے بجاتے شہر میں داخل اور دربار میں حاضر ہوئے۔ اُنھیں کے نوادر و غرائب میں اوّل ارغنوں (آرگن) ہندوستان میں آیا، وقت کے مؤرخ لکھتے ہیں "مگر معلوم ہوتا ہے کہ اِس باجے کو دیکھ کر عقل حیران اور ہوش سرگردان ہے"۔

دانایانِ مذکور نے دربارِ اکبری میں جو اعزاز پائے ہوں گے۔ بادبانوں نے اُڑا کر یورپ کے مُلک مُلک میں پہونچائے ہوں گے۔ اور جا بجا اُمیدوں کے دریا لہرائے ہوں گے۔ کسی موج نے بندر ہُگلی کے کنارے پر بھی ٹکّر کھائی ہوگی۔ اُمرا کی کارگذاری جدھر بادشاہ کا شوق دیکھتی ہے۔ اُدھر پسینہ ٹپکاتی ہے۔ چنانچہ سنہ ۲۳ جلوس میں شیخ ابو الفضل اکبر نامہ میں لکھتے ہیں کہ "خان جہاں حسین قلی خان نے کوچ بہار کے راجہ سے اطاعت نامہ

اور تحائف و نفائس اُس ملک کے لے کر دربار میں بھیجے"
تاب بارسو تاجر فرنگ بھی حاضر دربار ہوا۔ اور باسو بارن
تو بادشاہ کے حُسنِ اخلاق اور اوصاف طبع کو دیکھ کر
حیران رہ گیا۔ اور اکبر نے بھی اُن پر درستی عقل اور
شائستگی حال کا صاد کیا*

۳۵ھ میں لکھتے ہیں، پادری فریبتون بندر گووہ
سے اُتر کر حاضر دربار ہوئے۔ بہت سے عقلی اور نقلی
مطالب سے آگاہ تھے۔ شہزادگانِ تیز ہوش کو اُن کا
شاگرد کیا۔ کہ یونانی کتابوں کے ترجمے کا سامان فراہم اور
ہر رنگ کی باتوں سے آگاہی حاصل ہو پادری موصوف
کے علاوہ ایک گروہ انبوہ، فرنگی۔ ارمنی۔ حبشی وغیرہ کا
تھا۔ کہ ممالکِ مذکور کی عمدہ اجناس لایا تھا۔ بادشاہ
دیر تک سیر دیکھتے رہے*

۴۰ھ میں پھر ایک قافلہ بندر مذکور سے آیا۔
اشیاے عجیب و اجناس غریب لایا، اُن میں چند دانشور

صاحب ریاضت مذہب نصاریٰ کے تھے۔ کہ پادری کہلاتے ہیں۔ نوازش بادشاہی سے کامیاب ہوئے ؂

از آنریبل سر سیّد احمد خاں مرحوم

خوشامد

دل کی جس قدر بیماریاں ہیں۔ اُن میں سب سے زیادہ مُہلک۔ خوشامد کا اچھا لگنا ہے۔ جس وقت کہ انسان کے بدن میں ایسا مادّہ پیدا ہو جاتا ہے جو وبائی ہوا کے اثر کو جلد قبول کر لیتا ہے، تو اُسی وقت انسان مرض مُہلک میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اِسی طرح جب کہ خوشامد کے اچھا لگنے کی بیماری انسان کو لگ جاتی ہے تو اُس کے دل میں ایک ایسا مادّہ پیدا ہو جاتا ہے۔ جو ہمیشہ زہریلی باتوں کے زہر کو چوس لینے کی خواہش رکھتا ہے۔ جس طرح کہ خوش گلو گانے والے کا راگ اور خوش آیند باجے کی آواز انسان کے دل کو نرم کر دیتی ہے۔

اِسی طرح خوشامد بھی اِنسان کے دل کو ایسا پگلا دیتی ہے کہ ہر ایک کانٹے کے چُبھنے کی جگہ اُس میں ہو جاتی ہے۔ اوّل یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنی آپ خوشامد کرتے ہیں اور اپنی ہر ایک چیز کو اچھا سمجھتے ہیں۔ اور آپ ہی آپ اپنی خوشامد کر کے اپنے دل کو خوش کرتے ہیں۔ پھر رفتہ رفتہ اَوروں کی خوشامد ہم میں اثر کرنے لگتی ہے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ اوّل تو خود ہم کو اپنی محبّت پیدا ہوتی ہے پھر یہی محبّت ہم سے باغی ہو جاتی ہے۔ اور ہمارے بیرونی دشمنوں سے جا ملتی ہے اور جو محبّت و مہربانی ہم خود اپنے ساتھ کرتے تھے۔ وہ ہم خوشامدیوں کے ساتھ کرنے لگتے ہیں۔ اور وہی ہماری محبّت۔ ہم کو یہ بتلاتی ہے کہ اِن خوشامدیوں پر مہربانی کرنا نہایت حق اور انصاف ہے جو ہماری باتوں کو ایسا اچھا سمجھتے ہیں۔ اور اُن کی اِس قدر قدر کرتے ہیں۔ جب کہ ہمارا دل ایسا نرم ہو جاتا ہے اور اُس کے پھُسلاوے اور فریب میں آ جاتا ہے۔ تو ہماری

عقل خوشامدیوں کے مکر و فریب سے اندھی ہوجاتی ہے اور وہ مکر و فریب ہماری بیمار طبیعت پر بالکل غالب آجاتا ہے ٭

لیکن اگر ہر شخص کو یہ بات معلوم ہو جاوے کہ خوشامد کا شوق کیسے نالائق اور کمینہ سببوں سے پیدا ہوتا ہے، تو یقینی خوشامد کی خواہش کرنے والا شخص بھی ویسا ہی نالائق اور کمینہ متصور ہونے لگے۔ جب کہ ہم کو کسی ایسے وصف کا شوق پیدا ہوتا ہے، جو ہم میں نہیں ہے یا ہم ایسے بننا چاہتے ہیں۔ جیسے کہ درحقیقت ہم نہیں ہیں تب ہم اپنے تئیں خوشامدیوں کے حوالے کرتے ہیں جو اوروں کے اوصاف اور اوروں کی خوبیاں ہم میں لگانے لگتے ہیں۔ گو بسبب اس کمینہ شوق کے اس خوشامدی کی باتیں ہم کو اچھی لگتی ہوں۔ مگر درحقیقت وہ ہم کو ایسی ہی بدزیب ہیں۔ جیسے کہ دوسروں کے کپڑے جو ہمارے بدن پر کسی طرح ٹھیک نہیں۔ اس بات سے

کہ ہم اپنی حقیقت کو چھوڑ کر دوسرے کے اوصاف اپنے میں سمجھنے لگیں۔ یہ بات نہایت عُمدہ ہے کہ ہم خود اپنی حقیقت کو دُرست کریں۔ اور سچ مچ وہ اوصاف خود اپنے میں پیدا کریں۔ اور بعوض جھوٹی نقل بننے کے خود ایک اچھی اصل ہو جاویں۔ کیونکہ ہر قسم کی طبیعتیں جو اِنسان رکھتے ہیں۔ اپنے اپنے موقع پر مفید ہو سکتی ہیں۔ ایک تیز مزاج اور چست و چالاک آدمی اپنے موقع پر ایسا ہی مُفید ہوتا ہے۔ جیسے کہ ایک رونی صورت کا چُپ چاپ آدمی اپنے موقع پر۔

خودی جو اِنسان کو برباد کرنے والی چیز ہے۔ جب چُپ چاپ سوئی ہوتی ہے تو خوشامد اُس کو جگاتی اور اُبھارتی ہے اور جس کی خوشامد کی جاتی ہے۔ اُس میں چھچھورے پن کی کافی لیاقت پیدا کر دیتی ہے۔ مگر یہ بات بخوبی یاد رکھنی چاہیئے کہ جس طرح خوشامد ایک بدتر چیز ہے۔ اِسی طرح مناسب اور سچی تعریف کرنا نہایت عُمدہ

اور بہت ہی خوب چیز ہے۔ جس طرح کہ لائق شاعر دوسروں کی تعریف کرتے ہیں، کہ اُن اشعار سے اُن لوگوں کا نام باقی رہتا ہے، جن کی وہ تعریف کرتے ہیں، اور شاعری کی خوبی سے خود اُن شاعروں کا نام بھی دُنیا میں باقی رہتا ہے۔ دونوں شخص خوش ہوتے ہیں، ایک اپنی لیاقت کے سبب سے اور دوسرا اُس لیاقت کو تمیز کرنے کے سبب سے۔ مگر لیاقت شاعری کی یہ ہے، کہ وہ نہایت بڑے اُستاد مصوّر کے مانند ہو کہ وہ اصل صورت اور رنگ اور خال وخط بھی قائم رکھتا ہے، اور پھر بھی تصویر ایسی بناتا ہے۔ کہ خوشنما معلوم ہو، ایشیا کے شاعروں میں ایک بڑا نقص یہی ہے کہ وہ اِس بات کا خیال نہیں رکھتے، بلکہ جس کی تعریف کرتے ہیں اُس کے اوصاف ایسے جھوٹے اور ناممکن بیان کرتے ہیں۔ جن کے سبب سے وہ تعریف تعریف نہیں رہتی، بلکہ فرضی خیالات ہو جاتے ہیں ✤

شاعری کی مثال نہایت عُمدہ خوشبو کی ہے، جب ہوشیاری اور سچّائی سے ہماری واجب تعریف ہوتی ہے تو اُس کا ویسا ہی اثر ہوتا ہے۔ جیسے کہ عُمدہ خوشبو کا، مگر جب کسی کمزور دماغ میں زبردستی سے وہ خوشبو ٹھونس دی جاتی ہے تو ایک تیز بو کے مانند دماغ کو وہ پریشان کر دیتی ہے، فیاض آدمی کو بدنامی اَور نیکنامی کا زیادہ خیال ہوتا ہے، اور عالی ہمّت طبیعت کو مناسب عزّت اور تعریف سے ایسی ہی تقویّت ہوتی ہے جیسی کہ غفلت اور حقارت سے پست ہمتی ہوتی ہے۔ جو لوگ عوام کے درجہ سے اوپر ہیں۔ اُنھیں لوگوں پر اُس کا زیادہ اثر ہوتا ہے، جیسے کہ تھرمامیٹر میں وہی حصّہ موسم کا زیادہ اثر قبول کرتا ہے، جو صاف اور سب سے اوپر ہوتا ہے +

از مولوی کریم بخش صاحب مرحوم دہلوی

خط

زندگی میں خوش رہنے کی تدبیر یہ ہے کہ انسان اپنی

حالت کا مقابلہ اُن لوگوں کی حالت سے کیا کرے ۔ جو اُس سے رتبہ میں کم ہیں، اِنسان کو لازم ہے کہ اپنے لباس کو محتاجوں کے لباس سے، اپنے کھانے کو محتاجوں کے کھانے سے، اپنی خوشی کو رنجوروں کے رنج سے، اپنی صحّت کو بیماروں کی حالت سے، مقابلہ کرکے خدائے تعالیٰ کے انعاموں کا شکر اور اپنی احسان مندی کا اِقرار کیا کرے ۔ دُنیا میں ہزاروں آدمی ایسے ہیں کہ جاڑوں مرتے ہیں، اُن کو کافی کپڑا میسّر نہیں، لاکھوں آدمی ایسے ہیں کہ اپنے ہاتھ سے روٹی پکاتے ہیں ۔ اپنے ہاتھ سے پانی بھرتے ہیں، اپنے سر پر لکڑی کا بوجھ لادتے ہیں، بہت آدمی ایسے ہیں کہ اولاد کو ترستے ہیں، بہت ایسے ہیں کہ اولاد ہے کھانے کو نہیں، بہت ایسے ہیں کہ اولاد بھی ہے اور کھانے کو بھی ہے ۔ مگر اولاد نالائق بدکار، چور ۔

جن لوگوں کو خُدا ایسی مصیبتوں سے محفوظ رکھے اُن پر واجب ہے کہ ہر نعمت کو روزانہ یاد کرکے ہر دم

شکر کریں + حدیث میں آیا ہے کہ بندہ جو شکر نعمت کا کرتا ہے تو خداوند تعالیٰ اُس نعمت میں برکت عطا کرتا ہے۔ وہ نعمت قائم رہتی ہے اور نعمتوں کی افزونی ہوتی ہے اِسلئے ہر دم نعمت الٰہی کا شکر کرنا لازم ہے۔ جس وقت کوئی نعمتِ خوشی دے اُسی وقت اُس کا شکریہ دل سے ادا کرنا چاہیئے + ہم کو لازم ہے کہ دن بھر میں جب ذرا سی بھی خوشی ہو کسی طرح کی مسرّت حاصل ہو فوراً دل سے مُنعم کا شکر کرکے بندگانِ شکور میں داخل ہوں اور نعمت کی افزونی سے بہرہ مندی اور برخورداری حاصل کریں + صبح کو نماز پڑھ کر اور شام کو سونے کے قبل دو کام روز کرنے چاہییں، اول اُس کریم کارساز کی نعمتوں کو یاد کرکے اور شمار کرکے شکریہ ادا کرنا، اور دوسرے بُرائیوں اور گناہوں سے توبہ کرنی۔ اور اپنے قصوروں کی معافی اُس کریم و رحیم سے چاہنی۔ اگر یہ عادت پختہ ہو جائے۔ اور صبح و شام اِستغفار اور شکریہ کا

اظہار کیا جائے تو دل کو خوشی رہتی ہے۔ اور زندگی مسرت میں گذرتی ہے ❖

اکثر آدمی ایسے کم ظرف ہیں کہ اتراتے ہیں۔ اور اپنے تئیں کھینچتے ہیں، اترانا اور غرور کرنا خُدا کو ناپسند ہے۔ اترانے والوں کی نعمتیں، دیکھا جاتا ہے کہ بعض وقت چھین لی جاتی ہیں اور غرور کرنے والوں پر خدا کا قہر نازل ہوتا ہے، اس لئے لازم ہے کہ انسان ہر دم اپنے تئیں عاجز و بے حقیقت سمجھے اور یہ خیال کرے کہ جو کچھ اُس کریم کارساز نے دیا ہے اُس کی رحمت ہے، ہمارے پاس جتنی چیزیں ہیں سب اُسی کی دی ہوئی ہیں جب ہم پیدا ہوئے تو ہمارے پاس نہ عقل تھی۔ نہ تمیز نہ کپڑا نہ کھانا، نہ روپیہ نہ پیسہ، اُسی نے اپنی شفقت سے ماں باپ کے دل میں ہماری محبت ایسی ڈال دی کہ اُنھوں نے خود تکلیفیں اُٹھائیں اور ہم کو آرام دیا، سردی گرمی سے محفوظ رکھ کر ہم کو پالا ہماری ہر طرح کی

خبر گیری کی۔ دُکھ بیماری میں ہمارا علاج کیا۔ علاج سے زیادہ تیمار داری کی۔ پھر خُدا نے ہم کو عقل و تمیز دی عِلم اور رِزق دیا۔ طرح طرح کی نعمتیں عطا کیں، اُس بیکسی کی حالت سے اِس حالت کو پہونچایا۔ اِن مُستعار اور بخشی ہوئی چیزوں پر اِترانا۔ کیسی کم ظرفی اور بے عقلی ہے لاکھ لاکھ کرور کرور شکر اُس کارساز کا ہے جس نے ہم کو اِتنی نعمتیں عطا کیں۔ ہمارا کیا اِستحقاق تھا۔ ہم سب اُس کے بندے ہیں۔ کسی کو آسودگی دی۔ کسی کو محتاج کیا۔ یہ سب اُس کی مصلحت ہے۔

خط

مرزا پور

آج تُم کو اِحسان کے فائدے اور اِحسان کا اَثر بتلاتا ہوں۔ اِحسان کا اثر دل پر بہت ہوتا ہے۔ جانور کے ساتھ بھی اگر اِحسان کیا جائے۔ تو اُس کو اپنے مُحسن کی محبّت ہوجاتی ہے۔ جس آدمی پر اِحسان کیا جائے۔

وہ محبّت کرنے لگتا ہے۔ اگر کسی کو کچھ دیا جائے اُسی وقت وہ دل سے دُعائیں دیتا ہے رشتہ دار جو محبّت کرتے ہیں اُس کا بڑا سبب اِحسان ہے۔ ماں باپ اپنی اولاد کے ساتھ اِحسان کرتے ہیں۔ اِس لئے اولاد کو ماں باپ کی محبّت ہو جاتی ہے۔ اگرچہ بچّوں کو پوری تمیز اِحسان مندی کی نہیں ہوتی لیکن جس آدمی سے اُن کو راحت ملتی ہے۔ اُس کے ساتھ محبّت اور اُنس کرنے لگتے ہیں۔ غرض اِنسان کی سرشت میں یہ بات رکھی گئی ہے کہ اپنے مُحسن سے محبّت کرنے لگتا ہے۔ جن کے دِل اچھے ہیں۔ اور جنھوں نے تربیت اچھی پائی ہے اُن کا یہ حال ہوتا ہے کہ ایک اِحسان کو ساری عُمر نہیں بھولتے اور اِس ایک اِحسان کے بدلے ساری عمر اپنے مُحسن کے تابعدار اور ثنا خواں رہتے ہیں اچھے دِل کی یہ نشانی ہے کہ اِحسان کا اثر پورا ہو۔ دُنیا میں وہ آدمی بُرا سمجھا جاتا ہے۔ جو اپنے مُحسن کے ساتھ بُرائی کرے۔

اِس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جو کوئی ہمارے ساتھ اِحسان کرے ہم کو چاہیئے کہ اُس سے محبّت کریں۔ اُس کی تعظیم کریں، اُس کو راحت پہونچائیں، اُس کو ایذا نہ دیں ۔ اُس کی مُخالفت نہ کریں، جس نے ہمارے ساتھ سُلوک کیا ہو اور ہم کو راحت پہونچائی ہو۔ بڑی بد ذاتی کی بات ہے کہ اُس کو تکلیف دیں ٭ جب ایک اِحسان کے بدلے ہم پر فرض ہے کہ اپنے مُحسن کو تمام عمر نہ بھُولیں۔ تو جو کوئی ہم پر روز اِحسان کرے ۔اُس کی صِرف تابعداری اور خدمت ہی کرنی ہم پر لازم نہیں ۔ بلکہ ہم اُس کے غلام بن کر رہیں ۔اُس پر نثار ہو جائیں ۔ اُس کی محبّت کا کلمہ ہر دم ہماری زبان پر رہے تو زیبا ہے ٭

کیا خُدائے تعالیٰ ایسا مُحسن نہیں ہے جو ہر دم ہم پر اِحسان نہ کرتا ہو ؟ وہ ہمارا خالق ہم کو روز رزق دیتا ہے، تکلیفوں سے محفوظ رکھتا ہے ۔ ہم بیمار ہو جائیں ۔ تو شفا دیتا ہے ۔ اگر ہم گناہ کریں۔ وہ معاف کر دیتا ہے ہم کیسی ہی

نافرمانی کریں۔ کبھی ہم پر ناراض نہیں ہوتا۔ اُس کی اطاعت میں ہم کیسی ہی کوتاہی کریں۔ ہمارا رزق بند نہیں کرتا۔ سُبحان اللہ! کیسا عالی ظرف مُحسن ہے! ماں باپ ایک نافرمانی سے ناراض ہوجائیں۔ وہ باوجود صدہا نافرمانیوں کے ہم سے محبت کیے جاتا ہے۔ ہم اُس کی تابعداری نہیں کرتے۔ مگر وہ ہماری پرورش کیے جاتا ہے۔ ہم بے پروائی اور سرکشی کرکے اُس کی خدمت میں حاضر نہیں ہوتے۔ لیکن وہ بدستور اپنی شفقت ہم پر جاری رکھتا ہے۔ ہم اُس کو یاد نہیں کرتے۔ لیکن وہ ہمارے ساتھ ایسا سُلوک کرتا ہے کہ گویا ہم اُس کے خاص غلام اور خاص خانہ زاد ہیں۔

غور کرنے کی بات ہے کہ ایسے مُحسن کے کس قدر اور کتنے بڑے حقوق ہمارے ذمّہ ہیں۔ اُس کے ہر احسان پر ہم کو نثار ہونا چاہیئے، اُس کی ہر نعمت پر ہم کو ہزار ہزار شکر کرنا چاہیئے۔ اُس کی بندہ پروری اور ذرّہ نوازی

یاد کرکے ہم کو دِن رات اُس کے سامنے کھڑا رہنا چاہیئے
وہ ماں باپ سے بہت زیادہ شفیق ہے۔ اُس کی محبّت
ہم کو ماں باپ کی محبّت سے زیادہ ہونی چاہیئے۔ کیا
اُس کی شفقتوں کا یہی بدلہ ہے؟ کہ ہم دن رات میں
کبھی بھی اُس کو یاد نہ کریں۔ کیا اُس کے سُلوک اِسی لائق
ہیں؟ کہ ہم اُس کو بالکل بُھول جائیں۔ حاشا! اُس کے
سُلوک اِس قابل ہیں کہ ہمارا ایک ایک بال ہزار ہزار
زبان سے اُس کا نام دِن رات لیا کرے۔ تو بھی ہم اُس
کے اِحسانوں کا بدلہ ادا نہ کرسکیں۔ یا اللہ! ہم کو توفیق
دے کہ ہم اِحسان فراموشی نہ کریں۔ تُجھ کو مُحسن جانیں
اور مُنعِم سمجھیں ٭

از مؤلّف

خطوط

عزیزمن سلمہ اللہ تعالیٰ

تمھارے دو تار اور بعد ازاں دو خط بمبئی سے

پہونچے کھُنسی کی تکلیف سے تم گھبرا گئے۔ ہمیں بھی تھوڑی دیر فکر سا رہا۔ پھر اس خیال سے تسلّی ہوگئی کہ سمندر ہو یا خشکی خُدا ہر جگہ ساتھ ہے۔ وہی درد ہے وہی دوا۔ اُمید ہے کہ جلد آرام ہوگیا ہوگا۔ تم نے طامس کُک سے دریافت کرکے یہ نہ لکھا کہ ہم خط سیدھا مینچسٹر بھیجا کریں یا بمبئی کے دفتر کو۔ خیر اپنی رائے سے یہ خط سیدھا روانہ کرتے ہیں۔ خُدا کرے تم کو مل جاوے۔ یہاں سب بخیریت ہیں۔ آج کل نوچندی ہو رہی ہے۔ احسان آج لڑکوں کی ریس میں جیتا اور دو روپیہ انعام لایا۔ بہت خُوش ہے۔ اُس نے اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی بیل کی تصویر بھی نمائش میں رکھّی ہے۔ اولاد احمد صاحب کو اطلاع دے دی۔ اُن کو نوچندی کی سیر کے واسطے بھی لکھ دیا ہے۔ اُمید ہے کہ آج یا کل آجائیں۔ میں ابھی تک دِلّی نہیں گیا۔ نوچندی ہوچکے تو جاؤں گا۔ اِس ہفتہ میں ڈاڑھ کی تکلیف بہت رہی ابھی نکلوائی بھی

نہیں۔ ارادہ یہ ہے کہ دلّی ہی میں نکالی جائے تین سو روپیہ کے نوٹ جو تم نے دیے تھے لالہ رام چندر کے پاس تمھارے ہی نام سے جمع کر دیے ہیں۔ چک کا لفافہ میرے پاس ہے۔ دلّی جاؤں گا تو اُس کے نوٹ لے آؤں گا۔ فروری اور مارچ کی پنشن میں نے وصول کرلی ٭

آج تمھارے سفر کا چھٹا روز ہے خُدا کی عنایت سے اُمید ہے کہ تمھارا جہاز اب تو عدن سے بھی بخیریت روانہ ہوگیا ہوگا۔ خیر اب تو تمھارے خط کا انتظار ہے ۱۰۔اپریل کے اتوار کو تو شاید نہ ملے۔ آیندہ اتوار یعنے ۱۷۔اپریل کے اتوار تک انتظار کرنا پڑے گا۔ چار پانچ روز سے یہاں بڑی تیز و تُند ہوا دِن بھر چلتی تھی کل سے دھیمی ہوئی ہے۔

بس اب خط ختم کرتا ہوں کوئی ایسی بات نہیں جسکی اطلاع ضروری ہو۔ خُدا کرے تمھاری خیر و عافیت کی

اطلاع جلد جلد ملتی رہے۔ ڈاکٹر کدار ناتھ صاحب سے سلام و دعا کہدو۔

۲۵۔ مئی ۱۹۰۴ء روز چہار شنبہ از پانی پت

کل صبح ۴ بجے ہم میرٹھ سے روانہ ہو کر، بجے دِلّی پہونچے اولاد احمد اپنے تخت پر چاندنی چوک جا بیٹھے تھے اُن کو بُلوا کر تمھاری ڈاک دیکھی۔ پتّھر کا نمونہ تو مِلا جو محمد شاہ نے پہلے ہی کھول لیا تھا۔ کپڑے کا نمونہ نہیں پہونچا۔ شاید آیندہ ڈاک میں ملے۔ اُس کا جواب بعد دکھانے کے بابو صاحب سے لکھا دیا جائے گا۔ غرض دو ڈھائی گھنٹے دِلّی ٹھہرے اور ساڑھے دس بجے کی گاڑی میں پانی پت کو چل دیے منشی جی بھی ساتھ ہیں۔ یہاں پہونچکر نمونہ کا پتھر مولوی صاحب کو دکھایا بہت پسند کیا۔ حقیقت میں یہ پتھر اُس سے بہتر ہے۔ جو تم نمونہ لے گئے تھے۔ مولوی صاحب کہتے ہیں کہ ہم یہ نمونہ اجمیر روانہ کرینگے۔ اُمید ہے کہ تلاش

کرنے سے اِس قسم کا پتھر ملے۔ میر غالب حسین صاحب تین چار روز سے یہاں آئے ہوئے ہیں۔ تُم کو سلام کہتے ہیں۔ وہ لاہور میں بہت بیمار ہوگئے تھے۔ سخت درد قولنج کا ہُوا تھا۔ کسی ڈاکٹر نے دَوا کی پچکاری لگائی۔ مگر وہ کسی زہریلی دَوا سے آلودہ تھی۔ جس کا اثر اُن کے تمام بدن کے خون میں پھیل گیا۔ سخت تکلیف ہوئی۔ بہت کم زور ہوگئے ہیں۔ بھائی نواب بھی اِس وقت موجود ہیں سلام کہتے ہیں۔ ہمارے خطوں کا پتا لکھتے رہو کہ سب پہونچتے ہیں یا نہیں میں نے ۷۔ اپریل سے روانہ کرنے شروع کیے اور ہر ہفتہ برابر بھیجتا ہوں اِس سے پچھلی ڈاک میں تمھارا کوئی خط نہیں ملا۔ اور نہ اِس خط سے اُس کے نہ ملنے کا سبب معلوم ہوا۔ اب میرٹھ میں بیماری بہت کم ہوگئی ہے۔ دو ایک کیس ہو جاتے ہیں۔ تم خط برابر لکھتے رہو کوئی ہفتہ ناغہ نہ ہو۔ مولوی صاحب

اور منشی جی دعا کہتے ہیں ۔ اب یہ لفافہ بند کر کے
بھائی نواب کے معرفت ڈلواتا ہوں ۔ فقط

حصّۂ نظم

مثنویّات

از مؤلف

آبِ زلال

(۱)

خدا نے دی ہے تم کو عقل و تمیز
"ذرا دیکھو تو یہ پانی ہے کیا چیز
یہ مِل کر دو ہَواؤں سے بنا ہے
گرہ کُھل جائے، تو فوراً ہَوا ہے
نظر ڈھونڈھے، مگر کچھ بھی نہ پائے
زباں چکّھے، مزہ کچھ بھی نہ آئے
ہَواؤں میں لگایا خوب پھندا
انوکھا ہے تری قدرت کا دھندا
نہیں مُشکل اگر تیری رضا ہو
ہَوا پانی ہوا ور پانی ہَوا ہو
مزاج اُس کو دیا ہے نرم کیسا
جگہ جیسی ملے بن جائے ویسا
نہیں کرتا جگہ کی کچھ شکایت
طبیعت میں رسائی ہے نہایت
نہیں کرتا کسی برتن سے کھٹ پٹ
ہر اِک سانچے میں ڈھل جاتا ہے جھٹ پٹ
نہ ہو صدمہ سے ہرگز ریزہ ریزہ
نہ ہو زخمی اگر لگ جائے نیزہ

نہ اُس کو تیر سے تلوار سے خوف
نہ اُس کو توپ کی بھرمار سے خوف

تواضع سے سدا پستی میں بہنا
جفا سہنا مگر ہموار رہنا

نہیں ہے سرکشی سے کچھ سروکار
نہ دیکھو گے کبھی تم اُس کا انبار

خزانہ گر بلندی پر نہ ہوتا
تو فوّارے سے وہ باہر نہ ہوتا

جو ہلکا ہو اُسے سر پر اُٹھائے
جو بھاری ہو اُسے غوطہ کھلائے

نہ جلتا ہے نہ گلتا ہے نہ سڑتا
نرا پانی نہیں ہرگز بگڑتا

اُسے بھینچو، دباؤ، یا ٹٹولو
اُسے چھیڑو، اُچھالو، یا گھنگولو

اُسے رگڑو، گھسو، پیسو، بہاؤ
جھکولے دو، مسل ڈالو، دباؤ

کسی عنوان سے ہوگا نہ نابود
وہی پانی کا پانی دودھ کا دودھ

لگے گرمی تو اُڑ جائے ہوا پر
پڑے سردی تو بن جاتا ہے پتھر

ہوا میں مل کے غائب ہو نظر سے
کبھی اوپر سے بادل بن کے برسے

ہوا پر چڑھ کے پہونچے سیکڑوں کوس
کبھی اولا، کبھی پالا، کبھی اوس

کُہر ہے، بھاپ ہے، پانی ہے یا برف
کئی صیغوں میں ہے ایک اصل کی صرف

اُسی کے دم سے دُنیا میں تری ہے
اُسی کے فیض سے کھیتی ہری ہے

پھلوں میں پھول میں ہر پنکھڑی میں
ہر اک ٹہنی میں ہر بوٹی جڑی میں

ہر اک ریشہ میں ہے اُس کی رسائی
غذا ہے جڑ سے کونپل تک چڑھائی

پھلوں کا ہے اِسی سے تازہ چہرہ
اُسی کے سر پہ ہے پھولوں کا سہرہ

اُسی کو پی کے جیتے ہیں سب اِنساں
اُسی سے تازہ دم ہیں سارے حیواں

وہی معدہ کو پہونچاتا رسد ہے
وہی تحلیل میں کرتا مدد ہے

عمارت کا بسایا اُس نے کھیڑا
تجارت کا کیا ہے پار بیڑا

زراعت اُس کی موروثی اسامی
صناعت کے بھی اوزاروں کا حامی

کہیں ساگر کہیں جھاڑی، کہیں جھیل
کہیں جمنا کہیں گنگا، کہیں نیل

وہی پہلے زمیں پر موج زن تھا
نہ میدان تھا نہ پربت تھا نہ بن تھا

زمیں سب غرق تھی پانی کے اندر
جدھر دیکھو سمندر ہی سمندر

زمیں پوشیدہ تھی اُس کی بغل میں
نہ تھا کچھ فرق جل میں اور تھل میں

نہ بستی تھی نہ ٹاپو تھا کہیں پر
اُسی کا دَور دَورا تھا زمیں پر

نہ افریقہ، نہ امریکہ، نہ یُورپ
رہی تھی ایشیا اوشینیا چھُپ

ہمالہ نے بھی تھی ڈُبکی لگائی
نہ دیتی تھی کہیں چوٹی دِکھائی

نہ طارس تھا نہ بندھیاچل نہ بطین
نہ فارس تھا نہ ہندستان نے چین

مگر دُنیا میں یکسانی کہاں ہے
جواب دیکھو تو وہ پانی کہاں ہے

یہاں ہر چیز ہے کروٹ بدلتی
ہر اک حالت ہے چڑھتی اور ڈھلتی

کوئی شے ہو ہوا ہو یا ہو پانی
سبھی کو ہے بڑھاپا اور جوانی

رہا باقی نہ وہ پانی کا ریلا
اُسے خشکی نے پستی میں ڈھکیلا

زمیں آہستہ آہستہ گئی چوس
چھپائے مال کو جس طرح کنجوس

تری کا جب کہ دامن ہو گیا چاک
تو خشکی نے اُڑائی جا بجا خاک

پہاڑ اُبھرے ہوئے میدان پیدا
ہوئے میداں میں نخلستان پیدا

تری کا گو ابھی پلّہ ہے بھاری
لڑائی ہے مگر دونوں میں جاری

کیا کرتے ہیں دونوں کاٹ اور چھانٹ
چلی جاتی ہے باہم لاگ اور ڈانٹ

تری ہر دم چلی جاتی ہے اٹتی
کبھی خشکی بھی ہے کایا پلٹتی

تری کا تین چوتھائی میں ہے راج
تو خشکی ایک چوتھائی میں ہے آج

نہیں چلتی زمیں کی سینہ زوری
زمیں اک روز رہ جائے گی کوری

بہن رکھا تھا جب آبی لبادہ
موٹاپا بھی زمیں کا تھا زیادہ

مگر اب دن بدن چڑھتی ہے خشکی
تری گھٹتی ہے اور بڑھتی ہے خشکی

کمی بیشی نہیں آتی نظر کچھ
بہت عمروں میں ہوتا ہے اثر کچھ

شمس العلما مولانا خواجہ الطاف حسین حالی

ایک مسافر اور وطن کی یاد

مثنوی

(۲)

بیزار اِک اپنے جان و تن سے — بچھڑا ہوا صحبتِ وطن سے
غربت کی صعوبتوں کا مارا — چلنے کا نہیں ہے جس کو یارا
غمخوار ہے کوئی اور نہ دل جو — اِک باغ میں ہے پڑا لبِ جو
ہیں دھیان میں گلفتیں سفر کی — اپنے کی خبر ہے اور نہ گھر کی
ابر اتنے میں اِک طرف سے اُٹھا — اور رنگ سا کچھ ہوا کا بدلا
برق آ کے لگی تڑپنے پیہم — اور پڑنے لگی پھوار کم کم
آنے جو لگے ہوا کے جھونکے — تھے جتنے سفر کے رنج بھولے
سامان ملے جو دل لگی کے — یاد آئے مزے کبھی کبھی کے
دیکھے کوئی اُس گھڑی کا عالم — وہ آنسوؤں کی جھڑی کا عالم

وہ آپ ہی آپ گنگنانا — اور جوش میں آ کبھی یہ گانا
"اے چشمۂ آبِ زندگانی! — گھٹیو نہ کبھی تری روانی
جاتی ہے جدھر تری سواری — بستی ہے اُسی طرف ہماری
پائے جو کہیں مری سبھا کو — دیتا ہوں میں بیچ میں خُدا کو
اوّل کہیو سلام میرا — پھر دیجیو یہ پیام میرا
قسمت میں یہی تھا اپنی لکھا — فرقت میں تمھاری آئے برکھا
آتا ہے تمھارا دھیان جس دم — مُرغابیاں تیرتی ہیں باہم
ہم تم یونہیں صبح و شام اکثر — تالاب میں تیرتے تھے جا کر
جب سبزۂ و گُل ہیں لہلہاتے — صحبت کے مزے ہیں یاد آتے
ہم تم یونہیں ہاتھ میں دیے ہات — پھرتے تھے ہوائیں کھاتے دن رات
جب پیڑ سے آم ہے ٹپکتا — مَیں تم کو اِدھر اُدھر ہوں تکتا
آخر نہیں پاتا جب کسی کو — دیتا ہوں دُعائیں بیکسی کو
رُت آم کی آئی اور نہ ہوں یار — جی اپنا ہے ایسی رُت سے بیزار
تُم بن جو ہے بوند تن پہ پڑتی — چنگاری سی ہے بدن پہ پڑتی
ہے سرد ہوا بدن کو لگتی — پر دل میں ہے آگ سی سُلگتی

پردیس میں (سچ ہے) کیا ہو جی شاد   جب جی میں بھری ہو دیس کی یاد
نشتر کی طرح بھی دل میں چبھتی   فریاد یہ درد ناک اُس کی
تھا سوز میں کچھ مِلا ہوا ساز   پکڑا گیا دِل سن اُس کی آواز
حیرت رہی دیر تک کہ آخر   روڑا ہے کہاں کا یہ مُسافر
پھر غور سے اِک نظر جو ڈالی   نکلا وہ ہمارا دوست حالیؔ

از مُؤلّف

مناقشۂ ہَوا و آفتاب

(۳)

بادِ صحرا نے کہا یوں ایک روز   مہرِ تاباں سے کہ "اے گیتی فروز!
تو ہے علوی اور میں سفلی مگر   زور بازو میں ہوں میں تجھ سے زبر"
نیّرِ اعظم نے فرمایا کہ "ہاں!   ہو اگر ثابت زروئے اِمتحاں"
ورنہ ہے پا در ہوا یہ قال و قیل   ہیچ ہے دعویٰ نہ ہو جب تک دلیل"
بولی "جو یوں ہے تو اچھا یوں سہی   "ہاتھ کنگن کے لئے کیا آرسی"،
آئیے زور آزمائی کیجیے!   اِس بکھیڑے کی صفائی کیجیے!
اِک مُسافر اپنی دُھن میں تھا رواں   اُس کو ہاں دونوں نے تاکا ناگہاں

ہو گئے آپس میں طے قول و قرار — جو لبادہ لے مسافر کا اُتار
بس اُسی کے نام کا ڈنکا بجے — سر پہ دستارِ فضیلت وہ سجے
پھر تو آندھی بن کے چل نکلی ہوا — ایسی بپھری کر دیا طوفاں بپا
اونچے اونچے پیڑ تھرّانے لگے — جھوک سے جھوکوں کی چرّانے لگے
نو نہالوں کی کمر بل کھا گئی — پھول پتّوں پر قیامت آ گئی
کانپ اٹھے اُس دشت کے کل وحش و طیر — مانگتے تھے اپنے اپنے دَم کی خیر
ہو گیا دامانِ صحرا گرد برد — گھر گیا آفت میں وہ صحرا نورد
چاہتی تھی لوں لبادہ کو اُچک — مدّعی کو دوں سرِ میدان زَک
جب ہوا لیتی تھی چکّر میں لپیٹ — بیٹھ جاتا تھا وہ دامن کو سمیٹ
سینہ زوری سے نہ چوری سے ڈری — کر سکی لیکن نہ کچھ غارت گری
باندھ لی کس کر مسافر نے کمر — تا ہوا کا ہو نہ کپڑوں میں گذر
تھک گئی آخر نہ اُس کا بس چلا — ٹل گئی سر سے مسافر کے بلا
اب تھا جھکّڑ تو نکلا آفتاب — روئے نورانی سے سرکائی نقاب
تمکنت چہرے سے اُس کے آشکار — چال میں اک بُردباری اور وقار
وہ ہوا کی سی نہ تھی یاں دھوم دھام — کر رہا تھا چپکے چپکے اپنا کام

دھیمی دھیمی کرنیں چمکانے لگا — رفتہ رفتہ سب کو گرمانے لگا
اُس مسافر کو پسینا آ گیا — کھول ڈالے بند جی گھبرا گیا
اور آگے کو بڑھا۔ تو دھوپ سے — تن بدن میں کچھ تپنگے سے لگے
اب لبادہ کو لیا کاندھے پہ ڈال — بدلی یوں نوبت بہ نوبت چال ڈھال
جب چڑھا خورشید سمت الراس پر — بیٹھ کر سایہ میں پھر تو گھاس پر
دُور پھینکا اُس لبادہ کو اُتار — واہ رے سورج! لیا میدان مار
تیزی دُھندی کے گرد یدہ ہیں سب — کامیابی کا مگر ہے اَور ڈھب
اُس کا گُر ہے نرمی و آہستگی — سرکشی کی رگ اُسی سے ہے دبی

از شمس العلما مولانا نذیر احمد - ایل ایل ڈی (ڈاکٹر)

مثنوی

(۴)

گیا ہو جب اپنا ہی جیوڑا نکل — کہاں کی رُباعی! کہاں کی غزل
کسی شان میں گرچہ قاصر نہیں — مگر یاں طبیعت ہی حاضر نہیں
سفر دُور کا لوگ ہارے ہوئے — کہ ہیں خشک سالی کے مارے ہوئے
پنپنے نہیں پائے تھے کال سے — کہ طاعون آ دھمکی پاتال سے

ہزاروں کے گھر کر دیے بے چراغ
نہیں اب دلِ زار میں جائے داغ

اب آگے محل کا یارا نہیں
کہ دل ہی تو ہے سنگِ خارا نہیں

جو طاعون سے قحط سے تھے معاف
وہاں زلزلوں نے کیا ہاتھ صاف

غرض موت کا گرم بازار ہے
زمیں پر مگر آدمی بار ہے

پھر آخر کو سرحد کی جنگ و جدال
ایک آندھی چلی کر گئی پائمال

بافراط ملکی خزانوں کا خرچ
اور اُس پر گراں قدر جانوں کا خرچ

گورنمنٹ کا گر نہ ہوتا کرم
قیامت کے سامان تھے سب بہم

ہمارا انھیں ہر گھڑی دھیان تھا
کیا جس کے کرنے کا امکان تھا

بچایا - جلایا - بسایا ہمیں
رکھا ان کی رعایا خدایا ہمیں

الٰہی یہ شاہِ رعیت نواز
کہ عمرش باقبال و دولت دراز

خلائق پہ دائم رہے مہرباں
تو دل سے آمیں کہو یک زباں

ہو توفیق خیر اُس کے حکّام کو
کہ آرام دیں خاص کو عام کو

از مؤلّف

(۵) حیا

او حیا! او پاسبانِ آبرو! نیکیوں کی قوّتِ بازو ہے تو
پاک دامانی پہ تجکو ناز ہے کیا ہی تیرا دل پذیر انداز ہے
کھُپ گئی جس آنکھ میں تو مثلِ نور بدنگاہی سے رہی وہ آنکھ دُور
دامنِ عصمت کو تو رکھتی ہے پاک ہے سدا جرم و گنہ سے تجکو باک
گر نہ ہوتا درمیاں تیرا حجاب فعلِ بد سے کون کرتا اِجتناب
خواہشوں کو جو نہ تو دیتی لگام آدمی حیوان بن جاتے تمام
جب خطا کرتی ہے دل میں شور و شر تو ہی بن جاتی ہے واں سینہ سپر
ذلّت و خواری تجھے بھاتی نہیں تاب رُسوائی کی تو لاتی نہیں
تو مذمّت کو سمجھتی زہر ہے اَور ملامت تیرے حق میں قہر ہے
مُفلسوں کی ہے تو ہی پشت و پناہ تو سُجھاتی ہے عرق ریزی کی راہ
گو تہی دستی کے ہو جائیں شکار ہے مگر تجکو گدائی ننگ و عار
ہے ترے نزدیک مرجانا پسند پر نہیں ہے ہاتھ پھیلانا پسند

اِس قدر تجکو نہیں پرواے نان — جس قدر تو آن پہ دیتی ہے جان
آبرو کھوتی نہیں از بہر قُوت — لب پہ بن جاتی ہے تو مہرِ سکوت
اغنیا کے دل کو گرماتی ہے تو — بُخل اور خسّت سے شرماتی ہے تو
تو ہی سکھلاتی ہے اُن کو بذلِ مال — زخمِ خنجر ہے سمجھے ردِّ سوال

از مؤلّف

(۶) مثنوی بادِ مُراد

چل اے بادِ بہاری سمتِ گُلزار — تمنائی ہے تیرا ہر گُل و خار
نہال و نخل و سبزہ سب ہیں سنسان — گیاہِ مُردہ میں تو ڈال دے جان
نہیں گلشن میں پتّے کا بھی کھڑکا — ذرا شاخیں ہلا۔ طائر کو بھڑکا
لہک تیزی سے اے بادِ بہاری! — کہ ہو جائے چمن پر وَجد طاری
جو تو لہکے۔ تو سبزہ لہلہائے — چمن کا بیل بوٹا سر ہلائے
لچک جائے کمر نازک شجر کی — زمیں پر جُھک پڑے ڈالی ثمر کی
ٹپک جائے جو ہو پکا ہوا پھل — کہ شاخیں ہو رہی ہیں سخت بوجھل

سُنا بادِ صبا! کیا کیا خبر ہے
قلمرو میں تری کُل بحر و بر ہے

ذرا کر دامنِ صحرا میں راحت
بہت کی تو نے دریا کی سیاحت

بس اب آرام کر لوگوں کے گھر میں
رہی تا دیر تو سیر و سفر میں

ترے ہمرہ چلے آتے ہیں پیہم
یہی ہیں کیا سفیر بحرِ اعظم

جلَو میں ہے تری اک فوجِ جرّار
تو ہی ہے ابر کے لشکر کی سردار

اُٹھایا ہے سمندر تو نے سر پر
گھٹا کو لاد کر لائی کمر پر

تری تیزی سے ہیں بادل لپکتے
ترے جھونکوں سے ہیں قطرے ٹپکتے

کرے بادِ مراد! آہنگ آفاق
جہازِ مست رَو ہے تیرا مُشتاق

پھریرے کو اُڑا اکس بادباں کو
کہ دیکھیں ساحلِ ہندوستاں کو

خلیج و آبنائے و بحر و ساحل
ترے دیکھے پڑے ہیں سب مراحل

مقامِ اِستوا سے تا بہ قُطبین
تجھے جُنبش نہیں دیتی کبھی چین

بہت کھوندے ہیں کوہ و دشت تو نے
کیا بحرین کا گلگشت تو نے

محیطِ ارض ہے تو اے سُبک پا!
تری موجیں رواں ہیں مثلِ دریا

لطیف و نازک و بے رنگ ہے تو
اُصولِ نغمہ و آہنگ ہے تو

رواں ہے تیری موجوں میں ہر آواز
تو ہی کانوں میں ہے ہنگامہ پرداز

جہاں میں تو رسولِ ہر ندا ہے
مذاقِ سامعہ تجھ پر فدا ہے

نہ پہونچے تو اگر نا پردۂ گوش
سب آوازیں رہیں پردہ میں روپوش

وہ بہرا ہے جو تجھ سے بے اثر ہے
وہ گونگا ہے جو تجھ سے بہرہ ور ہے

زبانِ کو نطق کا یارا ہے تجھ سے
جہاں میں شور و شر سارا ہے تجھ سے

حجابِ دیدۂ بینا نہیں تو
نگہ سے گرچہ ہے پردہ نشیں تو

ترے کھانے سے دم لیتی ہے خلقت
ترے کھانے پہ دم دیتی ہے خلقت

ہمیں تیری ضرورت ہے بہر طور
نہیں ایسی ضروری شے کوئی اور

اگر اک لمحہ گذرے ہم پہ تجھ بن
تو ہو جائے تنفس غیر ممکن

ہے تیرا شغل دائم پاسِ انفاس
نہیں ہے ورنہ تجھ بن زیست کی آس

تو ہی ہے اے نسیمِ صبح گاہی
مثالِ رحمتِ عامِ الٰہی

جہاں میں ہیں ترے الطاف حادی
غریبوں اور امیروں پر مساوی

کبھی بنتی ہے ایسی تند و پُر شور
معاذ اللہ! معاذ اللہ! ترا زور

اگر تو خشمگیں اے تند خو! ہو
تہ و بالا جہازِ جنگ جو ہو

کبھی دریا میں لے جائے بہا کر
کبھی ساحل پہ دے پٹکے اُٹھا کر

اُڑاتی ہے اُسے تو راہ بے راہ
جہاز آگے ترے مثلِ پرِ کاہ

معاذاللہ ترا طوفان غضب ہے
تری تیزی نشانِ قہرِ رب ہے

اُجاڑا تو نے گلزار و چمن کو
ہلا ڈالا ہے جنگل اور بن کو

یہ چھیڑا نے میں کیسا راگ تو نے
نیستاں میں لگادی آگ تو نے

تری رفتار ہے بیباک کیسی
اُڑاتی ہے زمیں کی خاک کیسی

یہ گُل کترے ہیں تو نے بے تامل
کیا اِک دم زدن میں شمع کو گُل

کبھی گرمی سے گرما گرم ہے تو
کبھی سردی سے سرد و نرم ہے تو

چُرالیتی ہے تو پانی کو چُپ چاپ
نظر آتا نہیں جب بن گیا بھاپ

بُرودت کی پُولس نے تجکو گھیرا
تو کچھ کچھ مال مسروقہ بھی پھیرا

جو بادی چور تو ایسی نہ ہوتی
نہ پاتے صبح کو شبنم کے موتی

دبائیں تو نہیں دبنے سے انکار
تری عادت نہیں ہے ضدّ و اضرار

خوشامد تیری خصلت میں نہیں ہے
تری تیزی برابر کہیں سے ہے

اُجاڑا گر کسی مُفلس کا چھپّر
اُکھاڑا خیمہ و خرگاہِ لشکر

نہ درگذرے غریبوں کے مکاں سے
نہ جھجکے طُرّۂ تاجِ شہاں سے

نہیں کچھ تجکو خوفِ شانِ سُلطاں
اُڑایا پردۂ ایوانِ سُلطاں

کسی کا طُرّۂ طرّار چھیڑا
کسی کا برقعِ زرتار چھیڑا

غرض دلچسپ تیری ہر ادا ہے　　تری شوخی دچالاکی بجا ہے

غزلیّات

از شمس العلما مولانا خواجہ الطاف حسین حالی

(۱)

کب تک اے ابرِ کرم! ترسائے گا　　مینھ بھی رحمت کا کبھی برسائے گا
پھل کچھ اے نخلِ وفا تجھ میں نہیں　　جو لگائے گا تجھے پچتائے گا
رنگ گردوں کا ہے کچھ بدلا ہوا　　شعبدہ تازہ کوئی دکھلائے گا
ابر و برق آئے ہیں دونوں ساتھ ساتھ　　دیکھیے برسے گا یا برسائے گا
مشکلوں کی جس کو ہے حالی خبر　　مشکلیں آساں وہی فرمائے گا

(۲)

دیکھ اے اُمید! کیجو ہم سے نہ تو کنارا
تیرا ہی رہ گیا ہے لے دے کے اِک سہارا

یوں بے سبب زمانہ پھرتا نہیں کسی سے
اے آسماں! کچھ اس میں تیرا بھی ہے اِشارا
دُنیا کے خرخشوں سے چیخ اُٹھے تھے ہم اوّل
آخر کو رفتہ رفتہ سب ہو گئے گوارا
توفیق نے ہمیشہ لی تنت پر خبریاں
جب ناؤ ڈگمگائی پاس آ گیا کنارا
اِنصاف سے جو دیکھا نکلے وہ عیب سارے
جتنے ہُنر تھے اپنے عالم میں آشکارا
کیا پوچھتے ہو۔ کیونکر سب نکتہ چیں ہوئے چُپ
سب کچھ کہا اُنھوں نے۔ پر ہم نے دم نہ مارا
حالی سے کام ہے یاں۔ فعلوں سے اُس کے کیا کام
اچھا ہے یا بُرا ہے۔ پھر یار ہے ہمارا

خان بہادر سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی پنشنر جج

(۱)

کہو کرے گا حفاظت مری خدا میرا   رہوں جو حق پہ مخالف کریں گے کیا میرا

خُدا کے در سے اگر میں نہیں ہوں بیگانہ تو ذرّہ ذرّۂ عالم ہے آشنا میرا

سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر

(۱)

ہاں فردِ سوزِ دل اِک دم نہ ہوا۔ پر نہ ہوا
اور گریہ سے بڑھا کم نہ ہوا۔ پر نہ ہوا
چارہ گر کی نہیں تقصیر بہت کی تدبیر
کارگر زخم پہ مرہم نہ ہوا پر نہ ہوا
رات ہمسایوں نے اُٹھ اُٹھ کے دعائیں مانگیں
شورِ نالہ مرا مدّھم نہ ہوا۔ پر نہ ہوا
کِھل کِھلا کے ہنسے گلشن میں ہزاروں غنچے
دل ہمارا خوش و خرّم نہ ہوا۔ پر نہ ہوا
اے ظفرؔ! دیکھیے عقبیٰ میں ہو کیا حال اپنا
چین دُنیا میں تو اِک دم نہ ہوا۔ پر نہ ہُوا

(۲)

ہم نے دُنیا میں آ کے کیا دیکھا دیکھا جو کچھ۔ سو خواب سا دیکھا

ہے تو انسان خاک کا پُتلا　　لیک پانی کا بُلبُلا دیکھا
ایک دم پر ہَوا نہ باندھ حباب　　دم کو دم بھر میں یاں ہَوا دیکھا
نہ ہوے تیرے خاکِ پا۔ ہم نے　　خاک میں آپ کو مِلا دیکھا
اب نہ دیجے ظفرؔ کسی کو دِل　　کہ جسے دیکھا بے وفا دیکھا

(۳)

کہاں ڈھونڈا اُسے۔ کس جا نہ پایا　　کوئی پر ڈھونڈھنے والا نہ پایا
اُڑا کر آشیاں صرصر نے میرا　　کیا صاف اِس قدر تنکا نہ پایا
اُسے پانا نہیں آساں کہ ہم نے　　نہ جب تک آپ کو کھویا نہ پایا
صبا نے جس دم سیکھا ہے کس سے　　چمن میں مِلتے اِک بتّا نہ پایا
ظفرؔ دل جانے یا ہم، کون جانے؟　　کہ پایا اُس میں کیا؟ اور کیا نہ پایا

(۴)

آ، مثالِ آئنہ تو ہم سے ہو جا سینہ صاف
دُور کر دل سے کدورت ہے صفائی میں مزا
بیٹھ رہ آرام سے تو، صُلح کُل کر اختیار
جنگ جوئی چھوڑ دے، کیا ہے لڑائی میں مزا

کچھ تو ہو فریاد میں تاثیر، نالہ میں اثر
اے جرس! ہے ورنہ کیا ہرزہ دِرائی میں مزا
جو درِ فخرِ جہاں[۱] کا ہو گدا، اُس کو ظفرؔ!
بادشاہی سے زیادہ ہے گدائی میں مزا

(۵)

بن گئی جان پہ اور تو نے نہ جانا ہرگز
ہائے! تو اِتنا مرے حال سے انجان بنا
کر نہ شکوہ کہ مجھے یہ نہ دیا، وہ نہ دیا،
شکر کر تو کہ دیا ہے تجھے انسان بنا
صورت اپنی جسے اِک بار دکھائی اُس نے
اے ظفرؔ! صورتِ آئینہ وہ حیران بنا

نظیر اکبر آبادی

(۱)

گر عیش سے عشرت میں کٹی رات تو پھر کیا
اور غم میں بسر ہو گئی اوقات تو پھر کیا

---

[۱] مولانا فخر ایک بزرگ گذرے ہیں خاندان چشتیہ میں ۱۲

جب آئی اجل پھر کوئی ڈھونڈا بھی نہ پایا
قصّوں میں رہے حرف و حکایات، تو پھر کیا
پھر اُڑ گئی اِک آن میں سب حشمت و سب شان
لے شرق سے تا غرب لگا ہات۔ تو پھر کیا
اسپ و شتر و فیل و خر و نوبت و لشکر
گر قبر تلک[1] اپنے چلا سات۔ تو پھر کیا
اِس عُمر دو روزہ میں اگر ہو کے نجومی
سب چھان لیے ارض و سماوات۔ تو پھر کیا
دل ہی کا تو ملنا ہے بڑی چیز نظیرؔ! آہ!
بالفرض ہوئی اُس سے ملاقات۔ تو پھر کیا

(۲)

تنِ مُردہ کو کیا تکلّف سے رکھنا
گیا وہ تو، جس سے مزیّن یہ تن تھا
کئی بار ہم نے یہ دیکھا کہ جن کا
مشیّن بدن تھا۔ مُعطّر کفن تھا

---

[1] تلک متروک ہے تک مروج ہے ۱۲

جو قبرِ کہن اُن کی اُکھڑی، تو دیکھا
نہ عضوِ بدن تھا، نہ تارِ کفن تھا
نظیرؔ آ گئے ہم کو ہوش تھی کفن کی
جو سوچا، تو ناحق کا دیوانہ پن تھا

شیخ ابراہیم ذوقؔ خاقانی ہند

(۱)

نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا ۔ پُل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا
سُرمۂ چشمِ عزیزاں نہ بنا، میں اے چرخ ۔ کیا بنا خاک بغبارِ دلِ احباب بنا

۲

نام یوں پستی میں بالاتر ہمارا ہو گیا
جس طرح پانی کنوئیں کی تہ میں تارا ہو گیا
دل پہ زخموں کی ترقی سے ہوئی اور اِک بہار
آگے تھا صد برگ یہ گُل، اب ہزارا ہو گیا
ذوقؔ! اس بحرِ جہاں میں کشتیٔ عمرِ رواں
جس جگہ پر جا لگی، وہ ہی کنارا ہو گیا

میر محمد تقی میر

(۱)

بھری بستی میں رویت کچھ نہیں افلاس سے اپنی
الٰہی! ہووے مُنھ کالا شتاب اِس دستِ خالی کا
دماغ اپنا تو اپنی فکر ہی میں ہو چکا یک سر
خیال اب کس کو ہے اے ہمنشیں! نازک خیالی کا
نہ پہونچے جو دعا بھی میر واں تک تو عجب کیا ہے
عُلوِّ مرتبہ ہے بس کہ اُس درگاہِ عالی کا

(۲)

اندوہ سے ہوئی نہ رہائی تمام شب
مُجھ دل زدہ کو نیند نہ آئی تمام شب
چشمک چلی گئی تھی ستاروں کی صُبح تک
کی آسماں نے دیدہ درآئی تمام شب
تارے سے میری پلکوں پہ قطرے سرشک کے
دیتے رہے ہیں میر! دکھائی تمام شب

خواجہ حالی

گو جوانی میں تھی کجرائی بہت
پر جوانی ہم کو یاد آئی بہت

آ رہی تھی چاہِ یوسف سے صدا
دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت

ہم نے ہر ادنیٰ کو اعلیٰ کر دیا
خاکساری اپنی کام آئی بہت

کر دیا چُپ واقعاتِ دہر نے
تھی کبھی ہم میں بھی گویائی بہت

گھٹ گئیں خود تلخیاں ایام کی
یا گئی کچھ بڑھ شکیبائی بہت

ہم نہ کہتے تھے کہ حالی! چُپ رہو
راست گوئی میں ہے رُسوائی بہت

خواجہ حیدر علی آتش

نہ کسی کو کڑی کہی ہم نے
نہ کسی کی کڑی اُٹھائی بات

دردِ دل کہنے میں ہے کیا پس و پیش
کہی جاتی ہے مُنھ تک آئی بات

تازگی فکر کی کبھی نہ گئی
جب سُنائی نئی سُنائی بات

کہہ گئے تم کنایہ میں کیا کیا
نہ کسی نے تمھاری پائی بات

تم جو گویا ہوئے تو پھول جھڑے
غنچہ سے مُنھ میں رنگ لائی بات

یہ صدا آتی ہے خموشی سے
مُنھ سے نکلی ہوئی پرائی بات

تیرے شیریں کلام کو سُن کر
پھر نہ آتش! کسی کی بھائی بات

میر محمد تقی میر

ہوتی ہے گرچہ کہنے سے یارو پرائی بات
پر ہم سے تو تھمی نہ کبھی مُنھ پر آئی بات

جانے نہ تجکو جو، یہ تصنّع تو اُس سے کر
تسپر[۱] بھی تو چھپی نہیں رہتی بنائی بات

اب تو ہوے ہیں ہم بھی ترے ڈھب سے آشنا
واں تو نے کچھ کہا کہ اِدھر ہم نے پائی بات

عالم سیاہ خانہ ہے کس کا کہ روز و شب
یہ شور ہے کہ دیتی نہیں کچھ سُنائی بات

اب مُجھ ضعیف و زار کو مت کچھ کہا کرو
جاتی نہیں ہے مجھ سے کسو[۲] کی اُٹھائی بات

بُلبل کے بولنے میں سب انداز ہیں مرے
پوشیدہ کب رہے ہے کسو کی اُڑائی بات

۱؎ تسپر متروک اس کے بجاے پھر مستعمل ہے ۱۲
۲؎ اب کسو کی جگہ کسی بولتے ہیں ۱۲

خط لکھتے لکھتے میر نے دفتر کیے رواں
افراطِ اشتیاق نے آخر بڑھائی رات

حالی

کرتے ہیں سو سو طرح سے جلوہ گر
ایک ہوتا ہے اگر ہم میں ہنر

جانتے ہیں آپ کو پرہیزگار
عیب گوئی کر نہیں سکتے اگر

دوست اِس کے ہیں نہ اُس کے آشنا
گو بظاہر سب سے ہیں شیر و شکر

خصلتیں روباہ کی رکھتے ہیں ہم
گو دکھاتے آپ کو ہیں شیرِ نر

اپنی نیکی کا دلاتے ہیں یقیں
کرتے ہیں نفرت بدی سے جس قدر

کرنی پڑتی ہے کسی کی مدح جب
کرتے ہیں تقریر اکثر مختصر

گر کسی کا عیب سُن پاتے ہیں ہم
کرتے ہیں رُسوا اُسے دل کھول کر

کی نہیں جس سے کبھی کوئی بدی
شکر کے ہیں اُس سے خواہاں عمر بھر

ایک رنجش میں بھلا دیتے ہیں سب
ہوں کسی کے ہم پہ لاکھ احساں مگر

خیر کا ہوتا ہے ظن غالب جہاں
کھینچ کر لاتے ہیں اُس کو سوئے شر

بنتے ہیں یاروں کے ناصح تاکہ ہو
عیب اُن کا ظاہر اور اپنا ہُنر

دوست اِک عالم کے پر مطلب کے دوست
ایسے یاروں سے حذر! یارو حذر!

عیب حالی اپنے یوں کہتا ہے کون　　خواہش تحسین ہے حضرت کو مگر

خان بہادر سیّد اکبر حسین الہ آبادی

انسان اگر معرفتِ حق سے ہو غافل
کیا شک کہ بہائم ہیں اُس انسان سے بہتر
ہر حال میں ہے دل کے لئے حافظ و ناصر
دولت کوئی ممکن نہیں ایمان سے بہتر
یہ ہے کہ جُھکاتا ہے مخالف کی بھی گردن
سُن لو کہ کوئی شے نہیں اِحسان سے بہتر
سُن لے جو توجّہ سے بزرگوں کی نصیحت،
پھر کان جواہر نہیں اُس کان سے بہتر

خواجہ حیدر علی آتش

محبت کوڑیوں کے ہو اگر مول　　بنی آدم نہ لے یہ درد سر مول
عجب دولت ہے یہ احسان، اس سے　　بشر کو بھی ہے لے لیتا بشر مول
بھروسہ زندگانی کا نہیں کچھ
کفن لے رکھے اے آتش، بشر مول

مرزا محمد رفیع سودا

کیا مچائی اُس نے میرے دل کے کاشانہ میں دھوم!
شور ہے جس کے لئے کعبہ میں بُت خانہ میں دھوم!
مِٹ گئے وہ شور دل کے ہائے تب آئی بہار
ورنہ کیا کیا ہم بھی کرتے شہر و ویرانے میں دھوم
اِس قدر ہیں لاغری میری سے خوش اَبنائے جنس
جوں ہلالِ عید ہے میرے نظر آنے میں دھوم

شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالی

یاروں کو تجھ سے حالی اب سرگرانیاں ہیں
نیندیں اُچاٹ دیتی تیری کہانیاں ہیں
بنتے ہیں غیر اپنے ہوتے ہیں رام وحشی
اُلفت کی بھی جہاں میں کیا حکمرانیاں ہیں
اپنی نظر میں بھی یاں اب تو حقیر ہیں ہم
بے غیرتی کی یارو! اب زندگانیاں ہیں

روتے ہیں چار ہم پر ہنستے ہیں چار ہم پر
یاں تک ہماری پہونچی اب ناتوانیاں ہیں
خاور سے باختر تک جن کے نشاں تھے برپا
کچھ مقبروں میں باقی اُن کی نشانیاں ہیں
دیکھا نہیں ابھی کچھ قحطُ الرِّجال تم نے
اس سے بھی سخت آتی آگے گرانیاں ہیں
کھیتوں کو دے لو پانی اب بہ رہی ہے گنگا
کچھ کرلو نوجوانو! اُٹھتی جوانیاں ہیں
فضل و ہنر بڑوں کے گر تم میں ہوں تو جانیں
گر یہ نہیں۔ تو بابا وہ سب کہانیاں ہیں
رونے میں تیرے حالی! لذّت ہے کچھ نرالی
یہ خوں فشانیاں ہیں، یا گل فشانیاں ہیں

سیّد انشاء اللہ خاں انشا

شرائے مینھ کے ہیں یاں، بادل گرج رہے ہیں
نقارے سے فلک پر کچھ آج بج رہے ہیں

کاٹے ہیں ہم نے یوں ہی ایّام زندگی کے
سیدھے سے سیدھے سادے اور کج سے کج رہے ہیں
جو باندھنو بندھے ہیں آنشا یہ، وہ تو سُنیے
کیا آپ اپنی بیٹھے دستار سج رہے ہیں

نظیر اکبر آبادی

اُلفت و مہر و محبت سب ہیں جیتے جی کے ساتھ
مہرباں ہی اُٹھ گئے، یہ مہربانی پھر کہاں
جا پڑے چُپ ہو کے جب شہرِ خموشاں میں نظیر
یہ غزل، یہ ریختہ، یہ شعر خوانی پھر کہاں

خواجہ الطاف حسین حالی

(۱)

اِتنی ہی دشوار اپنے عیب کی پہچان ہے
جس قدر کرنی ملامت اور کو آسان ہے
دیکھ اے بلبل ذرا گُلبن کو آنکھیں کھول کر
پھول میں گر آن ہے کانٹے میں بھی اِک شان ہے

عقل کھیلی پر نہ سمٹی حرص و آز انسان کی
لے نہ اب نام آدمیت کا اگر انسان ہے
چیونٹیوں میں اتحاد اور مکھیوں میں اتفاق
آدمی کا آدمی دشمن، خدا کی شان ہے
دل میں حالی کے رہے باقی نہ بس ارمان کچھ
جی میں ہے کچھ اب اگر باقی تو یہ ارمان ہے

از خان بہادر سیّد اکبر حسین اکبر

(۱)

دنیا میں بے خبر ہے جو پروردگار سے
شاید، ہے زندہ اپنے ہی وہ اختیار سے
اے صانع ازل تری قدرت کے میں نثار
کیا صورتیں! بنائی ہیں مشتِ غبار سے

(۲)

کسی کی قسمت میں زہرِ غم ہے، کسی کو حاصل مے طرب ہے
وہی بگاڑے، وہی بنائے، اُسی کی قدرت کا کھیل سب ہے

گذر گیا ہے جو عہدِ عشرت، نہ رکھ تو ناداں پھر اُس کی حسرت
قیام اس کا سمجھ غنیمت، جو وقت پیشِ نگاہ اب ہے
یہاں بھی آرام پائیے گا، کہاں اب اِس وقت جائیے گا
اندھیرا چھایا ہے، ابر طاری ہے، مینھ برستا ہے، وقت شب ہے

(۳)

"آپس میں موافق رہو" طاقت ہے، تو یہ ہے
دیکھو نہ ہم عیب، محبت ہے، تو یہ ہے
صحت بھی ہو، روزی بھی ہو، دل کو بھی ہو تسکیں
دنیا میں بشر کے لئے نعمت ہے، تو یہ ہے

از سراج الدین بہادر شاہ ظفر

(۱)

روشن گل ہیں کہاں یار ہنسانے والے
ہم کو شبنم کی طرح سب ہیں رُلانے والے
سوزش دل کو نہیں اشک بجھانے والے
بلکہ ہیں اور بھی یہ آگ لگانے والے

خاک بھی ہوگی ترے کوچہ میں اپنی برباد
ہم تو مرکر بھی یہاں سے نہیں جانے والے

خاک میں ہم کو ملاتے ہیں وہ جوں نقش قدم
زیر پا جن کے ہم آنکھیں ہیں بچھانے والے

خط مرا پڑھ کے جو کرتا ہے وہ پُرزے پُرزے
اے ظفر کچھ تو پڑھاتے ہیں پڑھانے والے

(۲)

نہ رہی تاب و نے تواں باقی — ہے فقط تن میں ایک جاں باقی
دل بے سوز و گداز غم نہ رہا — نام کو مغز استخواں باقی
شمع ساں دل تو جل بجھا لیکن — ہے ابھی دل میں کچھ دھواں باقی
خال خال اس زمانہ میں ہوگا — اے ظفر کوئی نکتہ داں باقی

(۳)

جو یہ سچ ہے کہ دل کو دل سے ہے راہ — تو قاصد کی بھی کچھ پروا نہیں ہے
نہ کر تو خانۂ دل کی خرابی — کہ گھر تیرا ہے کچھ میرا نہیں ہے
نہ پوچھا درد دل جو تو نے اے بے درد — یہ بے رحمی ہے استغنا نہیں ہے
بھلائی کر کہ تیرا بھی بھلا ہو — برائی کا ثمر اچھا نہیں ہے

۴

چاہیے حد سے زیادہ نہ بشر چل نکلے
چلیے چال ایسی کہ کچھ کام ظفرؔ چل نکلے
قدر داں جب کہ ہنر کا نہ جہاں میں دیکھا
بے ہنر رہ گئے، اور اہلِ ہنر چل نکلے
کیا کہیں تم سے کدھر ہم گئے وحشت میں نکل
کہ جدھر لے گئی تقدیر اُدھر چل نکلے

(۵)

ہو ملاقات تو صفائی سے　　اور صفائی نہیں تو پھر کیا ہے
گلہ ہوتا ہے آشنائی میں　　آشنائی نہیں تو پھر کیا ہے
موت آئی تو ٹل نہیں سکتی　　اور آئی نہیں تو پھر کیا ہے
مفلسِ قابِ اغنیا ہونا　　بے حیائی نہیں، تو پھر کیا ہے
نہیں رونے میں گر ظفرؔ تاثیر　　جگ ہنسائی نہیں تو پھر کیا ہے

از مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ

کہوں جو حال، تو کہتے ہو، مدعا کہیئے
تمھیں کہو کہ جو تم یوں کہو، تو کیا کہیے

جو مدعی بنے، اُس کے نہ مدعی بنیے
جو ناسزا کہے اُس کو نہ ناسزا کہیے

کہیں حقیقتِ جانکاہیِ مرض لکھیے
کہیں مصیبتِ ناسازیِ دوا کہیے

کہیں شکایتِ رنجِ گراں نشیں لکھیے
کہیں حکایتِ صبرِ گریز پا کہیے

رہے نہ جان، تو قاتل کو خوں بہا دیجے
کٹے زبان، تو خنجر کو مرحبا کہیے

نہیں بہار کو فرصت، نہ ہو، بہار تو ہے
طراوتِ چمن و خوبیِ ہوا کہیے

سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالبؔ!
خدا سے کیا ستمِ و جورِ ناخدا کہیے

پھر اِس انداز سے بہار آئی (۲) کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی
دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک! اِس کو کہتے ہیں عالم آرائی
کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر رو کشِ سطحِ چرخِ مینائی
سبزہ کو جب کہیں جگہ نہ ملی بن گیا روئے آب پر کائی
سبزہ و گل کو دیکھنے کے لئے چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی

کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالبؔ
شاہِ دیں دار نے شفا پائی

از نواب سیّد محمد خاں رندؔ

(۱)

طرحیہ مشاعرہ چمن

چہکتے ہیں مرغِ چمن کیسے کیسے
کھلے ہیں گلِ یاسمن کیسے کیسے

ذرا دیکھ عبرت سے سوتے ہیں غافل
مزاروں میں پہنے کفن کیسے کیسے

کسی کے نہ ہتّے چڑھا راہ بھر میں
رہے گھات میں راہزن کیسے کیسے

جہاں گل تھے اِک خار بھی اب نہیں ہے
اُجاڑے خزاں نے چمن کیسے کیسے

ملے تھے ہمیں رندؔ کل اتفاقاً
رہے ذکرِ شعر و سخن کیسے کیسے

(۲)

خداوندِ ارض و سما ایک ہے
قسم ہے خدا کی خدا ایک ہے

برابر ہے اپنا وجود و عدم
ہماری بقا اور فنا ایک ہے

عدم ابتدا ہے، عدم انتہا
مرا ابتدا انتہا ایک ہے

ذرا غور سے مرآتِ دل کو دیکھ
یہ آئینۂ حق نما ایک ہے

جہاں میں ہیں غافل بہت سے طریق
مگر راہِ صدق و صفا ایک ہے

کہو گے جو کچھ، تو سنو گے بھی رندؔ
ہنسی میں تو شاہ و گدا ایک ہے

از خواجہ حیدر علی آتش

اک حال پر کبھی نہیں اس کو قیام ہے
دُنیا کا کارخانہ طلسمی مقام ہے

مطلب ہے دفترِ گل و لالہ میں مختصر
دو دن کی سیر میں یہ گلستاں تمام ہے

اک دن حضورِ قلب سے ہوتی نہیں ادا
زاہد تری نماز کو میرا سلام ہے

بت خانہ کھود ڈالیے مسجد کو ڈھائیے
دل کو نہ توڑیے، یہ خدا کا مقام ہے

بے باکیِ زباں سے نہیں کون خوفناک
ہر عضو اٹھ کے صبح کو کرتا سلام ہے

آتش بُرا نہ مانیو، حق حق جو پوچھیے
شاعر ہیں ہم دروغ ہمارا کلام ہے

از شیخ امام بخش ناسخ

ہمارا ہر نفس اک بادباں ہے
روانہ کشتیِ عُمرِ رواں ہے

تنِ خاکی میں قدر اپنی نہاں ہے
زمیں جیسے حجابِ آسماں ہے

کروں کیا احتیاطِ جسمِ خاکی
غبارِ توسنِ عُمرِ رواں ہے

زبس واژوں ہے اپنا کوکبِ بخت
زمیں اوپر ہے نیچے آسماں ہے

بحمد اللہ مرا ممدوح ناسخ
جگر بندِ امامِ انس و جاں ہے

از سیّد انشاء اللہ خاں اِنشاؔ

(۱)

صاحب کے ہر زہ پن سے ہر ایک کو گلہ ہے
میں جو نباہتا ہوں میرا ہی حوصلہ ہے
پھر کچھ گئے ہوؤں کی مُطلق خبر نہ پائی
کیا جانیے کدھر کو جاتا یہ قافلہ ہے
بارِ گراں اُٹھانا کس واسطے، عزیزو!
ہستی سے کچھ عدم تک تھوڑا ہی فاصلہ ہے

(۲)

زور بازو سے کماتے ہیں سو یہ کہتے ہیں
خشک روٹی میں مزہ ہے سو مزعفر میں نہیں
دل کو لے بھاگے کدھر ہاتھ سے تیرے انشاؔ
کوئی کھڑکی بھی تو اِس گنبدِ بے در میں نہیں

(۳)

یہ اتّفاق ہے، نہ بنے یا بنی رہے

پر آدمی کو چاہیئے، دل تو غنی رہے
نوّاب، دولھا، شیر بہادر، وزیر کی
جم جم سے مُلکوں مُلکوں میں نت روشنی رہے
دولت بنی ہے اور سعادت علی بنا
یارب! بنے بنی میں ہمیشہ بنی رہے
قائم رہے وہ چاند سا مکھڑا جہان میں
اُس کا بُرا جو چیتے اُسے جاں کنی رہے
ہمّت کبھی نہ ہاریے انشا! یہ چاہیئے
جو بات دل میں ٹھن گئی، بس وہ ٹھنی رہے

از میر محمد تقی میرؔ

زمیں اَور ہے آسماں اَور ہے (۱)، تب آگتا فکگتا سماں اَور ہے
نہ وہ لوگ ہیں اب نہ اِجماع وہ، جہاں وہ نہیں اب جہاں اَور ہے
نہ اِن لوگوں کی بات سمجھی گئی، یہ خلق اور اِن کی زباں اَور ہے
ہوا رنگ بدلے ہے ہر آن میرؔ، زمین و زماں ہر زماں اَور ہے

لہ۔ متروک اب اِس موقع پر "بدلتی ہے" بولنا چاہیئے ۱۲

(۲)

ہمارا تو ہے اصل مُدّعا تُو
خدا جانے ترا کیا مُدّعا ہے

حرم سے دیر اُٹھ جانا نہیں عیب
اگر یاں ہے خدا، واں بھی خدا ہے

نہیں ملتا سخن اپنا کسو سے[1]
ہماری گفتگو کا ڈھب جُدا ہے

مروں میں اس میں یا رہ جاؤں جیتا
یہی شیوہ مرا مہر و وفا ہے

تماشا کردنی ہے داغ سینہ
یہ پھول اِس تختہ میں تازہ کھلا ہے

کب اُس بیگانہ خو کو سمجھے عالم
اگرچہ یار عالم آشنا ہے

نہ عالم میں ہے نے عالم سے باہر
یہ سب عالم سے عالم ہی جُدا ہے

لگا میں گرد سر پھرنے، تو بولا
تمہارا میر صاحب سر پھرا ہے

(۳)

موسم ہے نکلے شاخوں سے پتّے ہرے ہرے
پودے چمن میں پھولوں سے دیکھے بھرے بھرے
آگے کسو کے کیا کریں دستِ طمع دراز
وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے

---

[1] اب کسی بولتے ہیں ۱۲

کیا سمجھیں اُس کے رتبۂ عالی کو اہلِ خاک
پھرتے ہیں جوں سپہر بہت ہم وَرے وَرے
گلشن میں آگ لگ رہی تھی رنگِ گل سے میرؔ
بلبل پکاری دیکھ کے صاحب! پَرے پَرے

(۴)

کرے کیا کہ دل ہے تو مجبور ہے — زمیں سخت ہے آسماں دُور ہے
تمنائے دل کے لئے جان دی — سلیقہ ہمارا تو مشہور ہے
دل اپنا نہایت ہے نازک مزاج — گرا گر یہ شیشہ، تو پھر چُور ہے
کہیں جو تسلّی ہوا ہو یہ دل — وہی بے قراری بدستور ہے

بہت سعی کریے[1]، تو مر رہیے میرؔ
بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے

(۵)

گفتگو ریختہ میں ہم سے نہ کر — یہ ہماری زبان ہے پیارے!
میرؔ! عمداً بھی کوئی مرتا ہے — جان ہے تو جہان ہے پیارے!

---

[1] "کریے" متروک ہے اب اس کے بجائے کیجیے بولتے ہیں ۱۲

اِدھر سے ابر اُٹھ کر جو گیا ہے (۶) ہماری خاک پر بھی رو گیا ہے
مصائب اور تھے پر دل کا جانا عجب اِک سانحہ سا ہو گیا ہے
مقامِ خانۂ آفاق وہ ہے کہ جو آیا ہے یاں کچھ کھو گیا ہے

سرہانے میر کے کوئی نہ بولو
ابھی ٹک[۵۱] روتے روتے سو گیا ہے

(۷)

کافر کا بھی رویّہ ہوتا نہیں ہے ایسا
ٹھوکر لگا کے چلنا کس دین میں روا ہے
دنیا میں دیر[۵۲] رہنا ہوتا نہیں کسی کا
یہ تو سرائے فانی اِک کارواں سرا ہے
عُمرِ عزیز گذری سب سے بُرائی کرتے
اب کر چلو بھلا کچھ، شاید یہی بھلا ہے
جو ہے، سو میر اُس کو "میرا خدا" کہے ہے[۵۳]
کیا خاص نسبت اُس سے ہر فرد کو جدا ہے

---

۵۱ "ٹک" متروک ہے اب ذرا بولتے ہیں ۱۲
۵۲ تک محذوف ہے مگر محاورہ حال میں یہ حذف جائز نہیں رہا ۱۲
۵۳ "کہے ہے" کے بجائے اب "کہتا ہے" مستعمل ہے ۱۲

قصائد

از خان بہادر سیّد اکبر حسین اکبر

(۱) تہنیت جشن جوبلی کوئن وکٹوریا قیصر ہند

سنہ ۱۸۸۷ء

زمانے میں خوشی کا دَور ہے، عشرت کا ساماں ہے
برنگ گل ہر اک باغ جہاں میں آج خنداں ہے
کوئن وکٹوریا کی جوبلی کی دھوم ہے ہر سو
اِدھر ہے نغمۂ عشرت اُدھر نور چراغاں ہے
جدھر دیکھو کھلی پڑتی ہیں کلیاں صحن گلشن میں
بھرا جوش مسرت سے ہر اک مرغ خوش الحاں ہے

بسانِ بوے گل ہر اِک ہے باہر اپنے جامے سے
نسیمِ گلشنِ عیش و مسرّت عطر افشاں ہے
چمک کر ہو گیا زیرِ فلک رشکِ قمر ہر گھر
یہی شب ہے کہ جس کا نور رشکِ مہر تاباں ہے
فروغِ اپنا جو دکھلاتی ہیں آتشبازیاں ہر سُو
کواکب مُضمحل ہیں، دیدۂ افلاک حیراں ہے
کہیں ہے رقص کی محفل۔ کہیں ہے جلسۂ دعوت
کہیں تصویر بنتی ہے کہیں سروِ چراغاں ہے
کہیں خیرات خانے جاری ہوتے ہیں کہیں مکتب
کہیں تقسیم کپڑوں کی پئے فصلِ زمستاں ہے
اثر جوشِ مسرّت کا ہے ہر ادنیٰ و اعلیٰ پر
کوئی فرماں روا ہے یا کوئی کم مایہ دہقاں ہے
کوئی ہے محوِ آسائش، کوئی مصروفِ آرائش
شگفتہ مثلِ گل چہرہ ہے دل شاداں و فرحاں ہے
تعجب کیا اگر ایسی خوشی ہے اہلِ عالم کو

یہ حیرت کیا جو قیصر کا - ہر اک دل سے ثنا خواں ہے
سریر آرائیٔ پنجاہ سالہ خیر و خوبی سے
محلِّ لطفِ باری ہے مقامِ شکر یزداں ہے
یہی ہندوستاں سب کہتے ہیں جنت نشاں جس کو
کوئن وکٹوریا کے عہد میں رشکِ گلستاں ہے
رئیس امن و اماں سے ناظرِ حال رعایا ہیں
ہری کھیتی زمینداروں کی ہے سرسبز دہقاں ہے
کمی بدلی کرے گر قطرہ افشانی میں کیا پروا
کہ فیض نہر دامانِ زمیں پر گوہر افشاں ہے
نظر سلطان کی ہے خاص تعلیم رعایا پر
اشاعت علم کی یہ ہے کہ سب کی عقل حیراں ہے
ہزاروں مدرسے قائم ہوے ہیں سیکڑوں کالج
جہاں فکرِ ارسطو بھی بس اک طفلِ دبستاں ہے
جہاں چلتا نہ تھا کچھ زور، واں اب ریل چلتی ہے
میسّر خاکساروں کو بھی اب تختِ سلیماں ہے

بچھ کھٹکا ہے چوروں کا نہ قزاقوں کی دہشت ہے
رواں بے زحمت و خوف و خطر ہر سمت انساں ہے
تجارت کی بھی ایسی ہو رہی ہے گرم بازاری
کہ سامانِ معیشت جنس دل سے بھی اب ارزاں ہے
طلسمِ تازہ دیکھا کارخانہ تار برقی کا
زبانِ تار پر وہ بات ہے۔ جو دل میں پنہاں ہے
رعایا کے حقوق اب ہر طرح محفوظ رہتے ہیں
اِدھر قانون حامی ہے۔ اُدھر حاکم نگہباں ہے
توجہ ہے مفیدِ عام کاموں کی طرف سب کو
کوئی ہے علم کا طالب ہُنر کا کوئی خواہاں ہے
شفاخانوں نے ثابت کر دیا ہے اِس مقولے کو
پئے ہر رنج راحت ہے، پئے ہر درد درماں ہے
خلوص و صدق دل سے ہے دعا ہندو مسلماں کی
کہ یارب جب تلک یہ گردشِ گردونِ گرداں ہے
فروغِ مہر و مہ سے جب تلک ہے نزہتِ عالم

نشاط انگیز جب تک انتظام باد و باراں ہے
دلِ اہلِ جہاں ہے جب تلک مرکز تمنا کا
ہوائے آرزو جب تک محیطِ قلبِ انساں ہے
خدا کے نام کی عزت ہے جب تک اہلِ دانش میں
تجلّی علم کی جب تک چراغ راہِ عرفاں ہے
ہماری حضرتِ قیصر رہیں اقبال و صحت سے
کہ جن کا آفتابِ عدل اس کشور پہ تاباں ہے

از خان بہادر سیّد اکبر حسین صاحب اکبر

(۲) بیٹے کی خوشی

بیٹے کو لوگ کہتے ہیں آنکھوں کا نور ہے
ہے زندگی کا لطف، تو دل کا سرور ہے
گھر میں اُسی کے دم سے ہے ہر سمت روشنی
نازاں ہے اُس پہ باپ، تو ماں کو غرور ہے

خوش قسمتی سے اُس کو نشانی سمجھتے ہیں
کہتے ہیں یہ خدا کے کرم کا ظہور ہے
اکبر بھی اِس خیال سے کرتا ہے اتفاق
اُس کا بھی ہے یہ قول کہ ایسا ضرور ہے
البتہ شرط یہ ہے کہ بیٹا ہے ہونہار
مائل ہے نیکیوں پر بُرائی سے دُور ہے
سُنتا ہے دل لگا کے بزرگوں کے پند کو
وقتِ کلام لب پہ جناب و حضور ہے
برتاؤ اُس کا صدق و محبت سے ہے بھرا
اُس میں نہ ہے فریب نہ کچھ مکر و زور ہے
افکار والدین میں ہے دل سے وہ شریک
ہمدرد ہے، معین ہے، اہل شعور ہے
راضی ہے اُس پہ۔ باپ کی جو کچھ ہو مصلحت
صابر ہے، با ادب ہے، عقیل و غیور ہے
رکھتا ہے خاندان کی عزت کا وہ خیال

نیکوں کا دوست صحبتِ بد سے نفور ہے
کسبِ کمال کی ہے شب و روز اُس کو دُھن
علم و ہنر کے شوق کا دِل میں وفور ہے
لیکن جو اِن صفات کا مطلق نہیں پتا
اور پھر بھی ہے خوشی۔ تو خوشی کا قصور ہے

از شمس العلما مولانا نذیر احمد مرحوم ایل ایل ڈی

(۳) انتخاب از قصیدہ

ڈرے بلا سے ہماری بلا کہ ہم کو نہیں
کسی گزند سے بیم و ہراس و خوف و خطر
ہمیں پناہ ہے وکٹوریا کی شفقت کی
ہم اُس کے بچے وہ ہم سب کی مہرباں مادر
گر آسماں نے کیا بُخل اور نہ برسا مینھ
کی اُس کے فیض نے باراں سے بڑھ کے بارشِ زر
جہاں کہیں ہے کوئی شے زقسم ماکولات

ہمارے پاس چلی آ رہی ہے لَدْ لَدْ کر
پلیگ آتے تو آئی پر اُس نے کیا دیکھا
کہ اُس کے دفع کی خاطر ہے مستعد لشکر
ہے ایک محکمہ حفظانِ تندرستی کا
ہزاروں آدمی از زیر دست تا افسر
جہاں دیکھے ہوئے ڈاکٹر گروہ گروہ
یہ کر کے چھوڑیں گے طاعوں کو کوئی دن میں بدر
غرض کہ جو ہوا جو ہو رہا ہے اُس سے سوا
جہاں میں کر نہیں سکتا ہے کوئی فرد بشر
دعائیں کیسے نہ دیں شرطِ آدمیّت ہے
کبھی ہوا ہے کہیں ایسا شاہِ نیک سیر
کوئین زندہ سلامت بخیر و با اقبال
یہی دعا ہے خدا سے ہماری آٹھ پہر

قطعات

خان بہادر سیّد اکبر حسین اکبر

(۱) تجارت

پاتی ہیں قومیں تجارت سے عروج — بس یہی اُن کے لئے معراج ہے
ہے تجارت واقعی اک سلطنت — زور یورپ کو اسی کا آج ہے
لفظ تاجر خود ہے اے اکبر! ثبوت — دیکھ لو تاجر کے سر پر تاج ہے

(۲) سرسیّد کی وفات

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سیّد کام کرتا تھا
نہ بھولو فرق جو ہے کہنے والے کرنے والے میں
کہے جو چاہے کوئی، میں تو یہ کہتا ہوں اے اکبر!
خدا بخشے، بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

(۳) آموں کی فرمائش

نامہ کوئی نہ یارؔ کا پیغام بھیجیے
اِس فصل میں جو بھیجیے بس آم بھیجیے
ایسے ضرور ہوں کہ اُنھیں رکھ کے کھا سکوں
پختہ اگر ہوں بیس تو دس خام بھیجیے
معلوم ہی ہے آپ کو بندہ کا ایڈریس
سیدھے الہ آباد مرے نام بھیجیے
ایسا نہ ہو کہ آپ یہ لکھیں جواب میں
تعمیل ہو گی ۔ پہلے مگر دام بھیجیے

(۴) شرم

جس کو خدا سے شرم ہے وہ ہے بزرگ دیں

---

۵۱ قطعہ میں مطلع کا دستور نہیں ہے لیکن یہ اشعار قطعہ بند ہیں اس لئے قطعات کی ذیل میں لکھے گئے ۱۲
۵۲ "پیام یار" ایک مشہور رسالہ کا نام ہے جس کے اڈیٹر کی خدمت میں یہ قطعہ ارسال ہوا تھا ۱۲

دنیا کی جس کو شرم ہے۔ مردِ شریف ہے
جس کو کسی کی شرم نہیں، اُس کو کیا کہوں؟
فطرت میں وہ رذیل ہے دل کا کثیف ہے

(۵) غفلت

جو بات مناسب ہے وہ حاصل نہیں کرتے
جو اپنی گرہ میں ہے اُسے کھو بھی رہے ہیں
بے علم بھی ہم لوگ ہیں غفلت بھی ہے طاری
افسوس! کہ اندھے بھی اور سو بھی رہے ہیں

(۶) وفاداری

میں نے کہا، کیوں لاش پہ آقا کی ہے مرتا
ہوٹل کی طرف جا کہ غذا بھی ہے کوئی چیز
کتّے نے کہا، ہو یہ جہالت کہ تعصّب
لیکن مرے نزدیک وفا بھی ہے کوئی چیز

(۷) نوکری اور جاہ طلبی

کچھ صنعت و حرفت پہ بھی لازم ہے توجہ
آخر یہ گورنمنٹ سے تنخواہ کہاں تک
مرنا بھی ضروری ہے، خدا بھی ہے کوئی چیز
اے حرص کے بندو! ہوسِ جاہ کہاں تک

(۸) قرض از مؤلّف

دامِ بلا ہے قرض، پھنسے اور ہوے شکار
ہے پاسِ آبرو۔ تو رہو ہوشیار تم
کنیاتے ہی رہو گے سدا قرض خواہ سے
اِس ننگ و عار کو نہ کرو اِختیار تم
دیکھو۔ یہ قرض وعدہ خلافی نہ دے سکھا
ہو جاؤ گے جہان میں بے اعتبار تم

جب تک وبالِ جان نہ جانو گے قرض کو
ہرگز نہ بن سکو گے کفایت شعار تم
گر دُرِ شاہوار ملے کوڑیوں کے مول
زنہار بھول کر بھی نہ لینا اُدھار تم
مقروض ہو گئے۔ تو پیادہ سے ہو بتر
مانا کہ رکھتے ہو فرسِ راہوار تم
غالب کہ ریل پر بھی ہو قطعِ سفر محال
جو قرض کے ٹکٹ سے ہوئے ہو سوار تم
کشتی نوح پر بھی چڑھے گر بطور قرض
مجکو یہ خوف ہے کہ نہ پہونچو گے پار تم
مقروض کی نہیں ہے زمانہ میں آبرو
یوں اپنے دل میں بات بناؤ ہزار تم
تم جانتے ہو گرچہ بُرا سود خوار کو
ہے اصل یہ کہ بن گئے بے سود خوار تم
وہ بندۂ درم سہی۔ اُس کا غُلام کون؟

اپنے ہی دل میں سوچ لو اپنا وقار تم
پھر ہو سکے گا کوئی بھی افسوں نہ کارگر
لُقمہ کو قرض کے نہ کرو زہر مار تم

شیخ ابراہیم ذوقؔ خاقانی ہند

(۹) شبِ تنہائی

کہوں، اے ذوق! کیا حالِ شبِ ہجر
کہ تھی اِک اِک گھڑی سو سو مہینے
نہ تھی شب ڈال رکھا تھا اِک اندھیر
مرے بختِ سیہ کی تیرگی نے
حواس و ہوش، جو مجھ سے قریں تھے
قرینے سے ہوئے سب بے قرینے
اُٹھایا گاہ اور گاہے بٹھایا
مجھے بے تابی و بے طاقتی نے

بہت دیکھا نہ دکھلایا ذرا بھی
طلوعِ صبح سے منہ روشنی نے
لگے پانی چُوانے منہ میں آنسو
پڑھی یٰسین سرہانے بےکسی نے
مگر دن عمر کے تھوڑے سے باقی
لگا رکھے تھے میری زندگی نے
کہ قسمت سے قریبِ خانہ میرے
اذاں مسجد میں دی بارے کسی نے
ہوئی ایسی خوشی، اَللّٰہُ اکبر
کہ خوش ہو کر کہا یہ خود خوشی نے
موذن، مرحبا! بر وقت بولا
تری آواز مکے اور مدینے

(۱۰) نیک و بد کی شناخت

آئینہ خانہ میں عالم کے سمجھ لے یہ مثال

تا تجھے جانیں کہ یہ صاحب نظر اچھا ہوا
ہے بُرا تو ہی، اگر آیا نظر تجکو بُرا
تو ہی اچھا ہے تجھے معلوم گر اچھا ہوا

(۱۱) دوست کو ٹھہرانے کے حیلے

وہ صبح کو آئے، تو کروں باتوں میں دوپہر
اور چاہوں کہ دن تھوڑا سا ڈھل جائے تو اچھا
ڈھل جائے جو دن بھی، تو اسی طرح کروں شام
اور پھر کہوں۔ گر آج سے کل جائے تو اچھا
جب کل ہو، تو پھر وہ ہی کہوں کل کی طرح سے
گر آج کا دن بھی یوں ہی ٹل جائے تو اچھا
القصہ نہیں چاہتا میں جائے یہاں سے
دل اُس کا یہیں گرچہ[1] بہل جائے تو اچھا

---

[1] گرچہ بجائے اگرچہ بولا گیا یہ پُرانا محاورہ ہے جو متروک ہو گیا ۱۲

سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر

(۱۲) تغیّر حالات

اِک وقت تھا کہ ٹوٹتے تھے دانت دود کے
پھر یہ ہوا گذرنے لگی کھیل کود کے
اب حال یہ ہے عالم پیری میں اے ظفر
باقی نہیں حواس بھی گفت و شنود کے

شیخ ولی محمد نظیر اکبر آبادی

(۱۳) احوال دِل

نظیر حضرت دِل کا نہ کچھ کھُلا احوال
خدا ہی جانے، یہ نُدرت مآب ہے کیا چیز
جو سخت ہووے تو ایسا کہ کوہ آہن کا
جو نرم ہووے۔ تو برگِ گلاب ہے کیا چیز

از شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالی

مسدّس

(۱) تعلیم

بس اب وقت کا حکمِ ناطق یہی ہے
کہ جو کچھ ہے دنیا میں تعلیم ہی ہے
یہی آج کل اصل فرماں دہی ہے
اِسی میں چھپا سرِّ شاہنشہی ہے
ملی ہے یہ طاقت اِسی کیمیا کو
کہ کرتی ہے یہ ایک شاہ و گدا کو

(۲)

سکھاتی ہے محکوم کو یہ اطاعت
سُجھاتی ہے حاکم کو راہِ عدالت
دلوں سے مٹاتی ہے نقشِ عداوت

جہاں سے اُٹھاتی ہے رسمِ بغاوت
یہی ہے رعیّت کو حقدار کرتی
یہی ہے کہ دمہ کو ہموار کرتی

(۳)

سُنی ہے غریبوں کی فریاد اسی نے
کیا ہے غلامی کو برباد اسی نے
ریپبلک[۵۱] کی ڈالی ہے بُنیاد اسی نے
بنایا ہے پبلک[۵۲] کو آزاد اسی نے
مقیّد بھی کرتی ہے یہ، اور رہا بھی
بناتی ہے آزاد بھی، باوفا بھی

(۴)

تجارت نے رونق ہے یہ اس سے پائی
کہ ہیچ اُس کے آگے ہے فرماں روائی

---

[۵۱] یعنے سلطنت جمہوری ۱۲
[۵۲] یعنے جمہور ۱۲

فلاحت کی یہ منزلت ہے بڑھائی
کہ فلّاح کرتے ہیں معجز نمائی
ترقی یہ صنعت کو دی ہے بلا کی
کہ ہوتی ہے معلوم قدرت خدا کی

(۵)

یہ نا اتّفاقی ہے قوموں سے کھوتی
یہ قومی محبّت کا ہے بیج بوتی
یہ آپس کے کینے دلوں سے ہے دھوتی
یہ دانے ہے سب ایک لڑ میں پروتی
یہ نقطوں پہ خط کی طرح ہے گذرتی
کروڑوں دلوں کو ہے یہ ایک کرتی

(۶)

جہاں یہ نہیں واں نہ قوم اور نہ ملّت
نہ مُلکی حمایت نہ قومی حمیّت
جدا سب کے رنج اور جدا سب کی راحت

الگ سب کی ذلّت الگ سب کی عزّت
خبر واں نہیں یہ کہ ہے قوم شے کیا؟
چھپا سرِّ حق اِس تعلّق میں ہے کیا؟

(۷)

جنھوں نے کہ تعلیم کی قدر و قیمت
نہ جانی، مسلّط ہوئی اُن پہ ذلّت
مُلوک اور سلاطیں نے کھوئی حکومت
گھرانوں پہ چھائی امیروں کے نکبت
رہے خاندانی نہ عزّت کے قابل
ہوئے سارے دعوے شرافت کے باطل

(۸)

نہ چلتے ہیں واں کام کاریگروں کے
نہ برکت ہے پیشہ میں پیشہ وروں کے
بگڑنے لگے کھیل سوداگروں کے
ہوئے بند دروازے اکثر گھروں کے

کماتے تھے دولت جو دن رات بیٹھے
وہ ہیں اب دھرے ہاتھ پر ہات بیٹھے

(۹)

نہ پاس اُن کے چادر نہ بستر ہے گھر کا
نہ برتن ہے گھر کے، نہ زیور ہے گھر کا
نہ چاقو۔ نہ قینچی۔ نہ نشتر ہے گھر کا
صراحی ہے گھر کی نہ ساغر ہے گھر کا
کنول مجلسوں میں۔ قلم دفتروں میں
اثاثہ ہے سب عاریت کا گھروں میں

(۱۰)

جو مغرب سے آئے نہ مالِ تجارت
تو مرجائیں بھوکے وہاں اہل حرفت
ہو تجار پر بند راہِ معیشت
دکانوں میں ڈھونڈھے نہ پائے بضاعت
پرائے سہارے ہیں بیپار واں سب

طفیلی ہیں سیٹھ اور تُجّار واں سب

مرثیہ رحلت کوئن وکٹوریا قیصر ہند

ترکیب بند

بند اول

شاہ ہوں یا ہوں گدا محکوم ہوں یا حُکمراں
وہ نہیں مرتے کبھی، جیتی ہیں جن کی نیکیاں
جاگتا ہے اُن کا تا روز قیامت نام نیک
گو کہ ہیں وہ بے خبر سوتے لحد کے درمیاں
چُپ ہیں، پر ہے بحر و بر میں پڑ رہی اُنکی پکار
گم ہیں، لیکن چپّے چپّے پر ہیں ثبت اُن کے نشاں
یاں رہے جب تک، رہے ایسے مرنجان و مرنج
غیر سمجھے اُن کو اپنا، اور دشمن مہرباں
اور چلے جس وقت دنیا سے گئے دنیا میں چھوڑ
خوبیوں کی اپنی۔ اِک اِک کی زباں پر داستاں

اُن کا جینا کیسی نعمت ہو گی دنیا کے لئے!
جن کا مرنا اُن کے حق میں ہے حیاتِ جاوداں
زندگی سے اُن کی ہرگز نیتیں بھرتی نہیں
پائیں گر بالفرض عُمرِ نوح بھی آکر یہاں
وقتِ رحلت یوں ترستی اُن کو رہ جاتی ہے خلق
ایک بجلی سی چمک کر ہو گئی گویا نہاں
جن کی ایسی زندگی اور جن کی ایسی موت ہو
اُن کا اُٹھ جاتا ہے بدبختی کا دنیا کی نشاں
آج گھر گھر ہے وہی ماتم جہاں میں جس سے ہے
زلزلہ میں کینیڈا سے لے کے تا ہندوستاں
اے کوئن اِسکندرینا! تجھ کو کیا آئی اجل!
تجھ سی دُنیا کے ہاتھوں سے گئی گویا نکل،

بند دوم

ہے تری نیکی سے امید اے زمیں کے بادشا!
آسمانی بادشاہت میں خدا دے تجھکو جا

کر لیے تھے سب بیگانوں اور بے گانوں کے دل
نیکیوں سے تو نے اپنی فتح اے وکٹوریا"!
ہے دلیل اُس کے لئے کافی فقط تیری مثال
مرد پر عورت فضیلت کا کرے گر اِدّعا
کیجیے اِقبال مندی پر اگر تیری نظر
سامنے تیرے نہیں جچتا کوئی کشور کشا
مرتبہ ہے جو کہ سرحد سے تصوّر کی پرے
قوم کو واں تک ترے اِقبال نے پہونچا دیا
کی تجارت نے ترقّی عہد میں یاں تک ترے
سلطنت ہے اُس کے آگے ہیچ بے چون و چرا
جس قدر علمی فتوحات اِس زمانہ میں ہوئیں
دہر کی تاریخ میں ملتا نہیں اُن کا پتا
علم میں روز ازل سے تھی جو اک طاقت نہاں
صاحبی میں تیری یہ راز آشکارا ہو گیا
ہو گئے ہر بحرِ اعظم میں ترے بر پا علم

تیرے بیڑوں اور جہازوں سے سمندر پٹ گیا
شاعروں کے جس قدر مدح سلف میں تھے غلو
حق میں تیرے وہ حقائق بن گئے سرتا بپا
تھی خبر کس کو؟ ہو اِک خردل کا پیڑ اتنا بڑا
جس کی شاخوں پر کریں بسرام مُرغانِ ہوا

بند سوم

دستِ قدرت نے بنایا گو کہ تھا عورت تجھے
پر جواں مردوں پہ تھی عالم کے فوقیت تجھے
سچ ہے وہ وارث زمیں کے ہونگے جو ہونگے حلیم
حلم سے اپنے ملی آفاق میں مکنت تجھے
وہ تسلّی پائیں گے دنیا میں جو جھیلیں گے غم
ہو چکے غم بس تسلّی دے گی اب راحت تجھے
تو مبارک تھی کہ تجکو صُلح تھی دل سے پسند
دے گا فرزندی کا اب اپنی خدا خلعت تجھے
تو مبارک تھی کہ تھا پہلو میں تیرے پاک دل

ہو مبارک خلد میں دیدار کی نعمت تجھے
مُلک میں اک نور تھی تو جیسے ڈیوٹ پر چراغ
دیکھ کر ہوتا تھا روشن مُلک اور ملّت تجھے
تو نمک تھی سر بسر گویا زمیں کے واسطے
ملک کا مصلح تصور کرتی تھی خلقت تجھے
دشمنوں پر مہرباں تھی تو بروں سے تھی بھلی
حق نے دی اپنی خلافت کی تھی اہلیّت تجھے
تجھ سے غیروں کو محبت تھی جو تھا اپنوں کو فخر
غیر اور اپنے کریں گے یاد تا مُدّت تجھے
برکتیں دُنیا میں پھیلیں تیرے دم سے جس طرح
بس یونہی کُنج لحد میں دے خدا برکت تجھے
فرد تھی اقبال میں تو بے نظیر اخلاق میں
تیرے مرنے سے ہے سنّاٹا سا اک آفاق میں

بند چہارم

ہوگیا برٹن تو تیرے عہد دولت میں نہال

ہم پہ بھی کچھ کم نہیں برسا ترا ابرِ نوال
شکر بندوں کا خدا کے جو نہیں کرتے ادا
وہ نہیں لاتے بجا شکرِ خدائے ذوالجلال
ہند نے پایا ترے دورِ حکومت میں وہ امن
اگلے دوروں میں نہ تھا جس کا کبھی خواب و خیال
لی گئی قحط اور وبا میں مُلک کی جو یاں خبر
تھا زمانہ تیرا اُس میں آپ ہی اپنی مثال
شکرِ آزادی کا تیرے عہد کی ممکن نہیں
سب کا اِس احسان میں جکڑا ہوا ہے بال بال
ہم سمجھ لیتے کہ ہیں ہر قید سے آزاد ہم
قیدِ احساں سے ترے چھُٹنے کی گر ہوتی مجال
گرچہ ممکن ہے کہ تیرے عہد و دولت مہد میں
ہوں رعیت میں تری کچھ لوگ زار اور خستہ حال
پر خُدا کی سلطنت میں بھی یہی ہے حالِ خلق
یاں خوشی ہے واں مصیبت واں سماں ہے یاں ہے کال

گو کوئی قانونِ قدرت خالی از حکمت نہیں
پر نہیں راس ایک کو جو ایک کے ہے حسبِ حال
ہوں قوانینِ الٰہی یا قوانینِ بشر
ہے برابر سب کا راضی اور خوش رہنا محال
الغرض اِس سے سِوا خوبی نہ تھی اِمکان میں
کر گئی تو راج جس خوبی سے ہندُستان میں

رُباعیاں

از شمسُ العلما خواجہ الطاف حسین حالؔی

(۱) خود اِعتمادی

اُترو دریا سے اپنے بل تَیر کے پار
کب تک تَیرو گے ہو کے تونبوں پہ سوار
تم ڈوبنے کے یہ کر رہے ہو ساماں
اوروں کا سہارا تکنے والو! ہُشیار!!

(۲) اِحتیاط

یا نفس کی خواہشوں کو روک، اے زردار!
یا فاقہ و فقر کے لئے رہ تیّار
لاگے ہوے ہیں چارطرف گھات میں چُور
گھر سے ہُشیار! مال و زر سے ہُشیار!!

(۳) تقاضائے سن

حالی کو جو کل فسردہ خاطر پایا
پوچھا باعث تو ہنس کے یہ فرمایا
رکھو نہ اب اگلی صحبتوں کی امید
وہ وقت گئے اب اور موسم آیا

(۴) آثار زوال

آبا کو زمین و ملک پر اطمینان
اولاد کو سستی پہ قناعت کا گمان
بچے آوارہ اور بے کار جواں
ہیں ایسے گھرانے کوئی دن کے مہماں

(۵) مکر و ریا

حالی رہِ راست جو کہ چلتے ہیں سدا

خطرہ اُنھیں گرگ کا نہ ڈر شیروں کا
لیکن اُن بھیڑیوں سے واجب ہے حذر
بھیڑوں کے لباس میں ہیں جو جلوہ نُما

(۶) عفو با وجود قُدرتِ انتقام

موسیٰ نے یہ کی عرض کہ اے بارِ خُدا
مقبول ترا کون ہے بندوں میں سوا
ارشاد ہوا بندہ ہمارا وُہ ہے
جو لے سکے اور نہ لے بدی کا بدلا

از مؤلّف

(۷) ہمّت

جس درجہ ہو مشکلات کی طغیانی
ہو اہلِ ہمم کو اَور بھی آسانی
تیراک اپنا ہُنر دکھاتا ہے خوب
ہوتا ہے جب اُس کے سر سے اونچا پانی

(۸) حُبِّ دُنیا

یہ قول کسی بزرگ کا سچّا ہے
ڈالی سے جُدا نہ ہو تو پھل کچّا ہے
چھوڑی نہیں جس نے حُبِّ دُنیا دل سے
گو ریش سُفید ہو مگر بچّا ہے

از قلندر بخش (جرأت)

(۹) نیک برتاؤ

ہستی گویا ہے اِک مُسافر خانہ
ہر روز ہے قافلوں کا آنا، جانا
رنجیدہ کسی کو یاں نہ رکھ اپنے سے
پھر جا کے نہیں ہے اِس سرا میں آنا

WORKS BY THE AUTHOR.

	Prices. Rs.	A.	P.
dib-i-Urdu ...	... 0	8	0
rdu Primer ...	... 0	0	9
rdu Reader I ...	... 0	1	6
Do. II ...	... 0	3	0
Do. III ...	... 0	4	0
Do. IV ...	... 0	4	6
Do. V ...	... 0	5	3
uzuk-i-Urdu ...	... 1	8	0
Do. Small ...	... 0	9	6
ıfeena-i-Urdu ...	... 0	8	0
ulliat-i-Ismail (cloth bound)	... 2	6	0
urjuman-i-Farsi ...	... 0	2	6
rdu Grammar Part I ...	... 0	1	9
Do. II ...	... 0	3	3
wad Urdu ...	... 0	4	3

TO BE HAD OF

NEWUL KISHORE PRESS, LUCKNOW.

Printed by K. D. Seth, at the Newul Kishore Press, Lucknow.

OUP—787—13-6-75—10,000.

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. Accession No.

Author

Title

This book should be returned on or before the date last marked below.

کتب خانہ جامعۂ عثمانیہ

۱۔ اراکین مجلس اعلیٰ، مجلس رفقاء، مجلس انتظامی، مجالس تعلیمات و نصاب پانچ کتابیں ایک ماہ تک اپنے پاس رکھ سکینگے۔
۲۔ اساتذۂ جامعۂ عثمانیہ و کلیات متعلقہ و گزیٹیڈ عہدہ داران جامعہ اور اراکین دار الترجمہ درسی کتابیں ایک ماہ تک اپنے پاس رکھ سکینگے۔
۳۔ طلبائے ایم۔ اے، ایل ایل بی و تحقیقاتی جماعتوں سے [illegible] شدہ دو کتابیں، بی۔ اے اور انٹرمیڈیٹ کے طلبہ تین کتابیں [illegible] دو ہفتہ تک اپنے پاس رکھ سکینگے۔
۴۔ مدت مقررہ پر کتابیں واپس نہ ہوں تو طلبہ سے [illegible] حساب ایک آنہ یومیہ فی کتاب جرمانہ لیا جائیگا۔
۵۔ بشرط موقع کتابیں گھر جاری کی جاسکینگی مگر اس غرض کیلئے [illegible] کتب خانہ میں کتاب کا لانا لازم ہے۔
۶۔ کتابیں گم یا خراب ہو جائیں تو [illegible] ذمہ داری عائد ہوگی۔
۷۔ کتابوں پر کسی قسم کا نشان یا [illegible] نہ لگایا جائے۔
۸۔ قلمی نسخے اور حوالے کی کتابیں [illegible] نہ دی جاسکینگی۔ فقط